حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے علومِ شریعت، طریقت اور حقیقت (معرفت)
سے کتابچوں کا سلسلہ

شاہرائے معرفت

جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ کتابچہ نمبر 1

زیر سرپرستی

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم العالیہ

مقصد: اسلاف کی تحقیقات سے اُمت کو آجکل کی سمجھ میں آنے والی زبان میں روشناس کرنا

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ

مکان نمبر 1/CB-1991 گلی نمبر 4 بلقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ

آشیانہ چوک، اللہ آباد، ویسٹرج 3، راولپنڈی

مضامین کی فہرست

دیباچہ	1
حمد باری تعالیٰ	3
نعت شریف	4
مختصرات سلوک	5
مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ	7
مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ	32
معرفت الٰہی کا حصول	40

دیباچہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ط وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

پیشِ خدمت کتابچہ کی ابتداء حمد و ثنا اور نعت شریف سے کی گئی ہے جو بندے کی کتاب پیغام محبت سے لی گئی ہیں۔ اس کے بعد مختصراتِ سلوک سے اقتباس ہے جو بقول ڈاکٹر ارشد صاحب، کئی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے۔ کیونکہ یہ ان کا نچوڑ ہے۔ اس کے بعد ایک مضمون حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مکتوب شریف کی تشریح پر مبنی شامل کیا گیا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں علم و عرفان کے وہ وہ نوادرات اور موتی جمع ہیں جن کا پتا ان کے معلوم ہونے کے بعد چلتا ہے مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس دیکھیں۔

> ”شریعت کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ شریعت کی صورت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تمام احکامِ شرعیہ پر جو اس (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے آئے ہیں ان پر ایمان لانا ہے اور باوجود نفسِ امارہ کی مزاحمت اور اس کی سرکشی، بغاوت اور انکار کے جو اس کی جبلت (عادت) میں رکھی ہوئی ہے احکامِ شرعیہ کا بجالانا ہے۔ اس مقام پر اگر ایمان ہے تو وہ ایمان کی ظاہری صورت ہے اور اگر نماز ہے تو وہ بھی نماز کی ظاہری صورت ہے اور اگر روزہ ہے تو وہ بھی روزہ کی ظاہری صورت ہے، اسی پر دوسرے تمام احکامِ شرعیہ کو قیاس کرنا چاہیے۔ کیونکہ وجودِ انسان میں نفس ایک عمدہ جز ہے۔ اور ”انا“ کے قول سے ہر فرد کا مشارٌالیہ بھی یہی (نفس) ہے جو اپنے کفر و انکار پر ڈٹا ہوا ہے، لہٰذا ایمان کی حقیقت اور اعمالِ صالحہ کی حقیقت کیونکر متصور ہو سکتی ہے۔
>
> اور یہ رحمتِ خداوندی جل سلطانہٗ ہے کہ محض صورتِ (ایمان و اعمال) کو قبول فرما کر جنت میں داخل ہونے کی بشارت دے دی جو اس تعالیٰ کی رضا کا مقام ہے، اور یہ بھی اس تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے نفسِ ایمان میں صرف تصدیقِ قلب پر کفایت فرمائی ہے اور نفس کے اذعان (فرمانبرداری) کی تکلیف نہیں دی۔ ہاں جنت کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔“

اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف تصدیق قلب مانگی ہے۔ اس میں نفس کی اصلاح کا مطالبہ نہیں اور اعمال میں نفس کی اصلاح کا مطالبہ ہے۔ پس جس کی جتنی جتنی اصلاح ہوتی ہے اس کے مطابق اس کے اعمال کا اجر بڑھتا ہے۔ اور جنت میں جنت کی چیزوں سے بقدر اپنی معرفت کے مزہ پائے گا۔ جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "عارف کی دو رکعت نماز غیر عارف کی ایک لاکھ رکعتوں سے افضل ہوتی ہیں۔"

اس کے بعد کا مضمون حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تعلیمات کے تعارف پر مبنی ہے۔ اس میں مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ سے مدد لی گئی ہے۔ یہ کتاب عرصہ دراز سے کسی کے مطالعے میں نہیں تھی اور بڑے بڑے علماء کرام نے اس کی تعلیم سے معذوری ظاہر کی تھی۔ کیونکہ اس میں تصوف کے وہ مقامات زیر بحث ہیں جو بہت گہرے ہیں اور جب تک ان کے مفاہیم تک رسائی نہ ہو تو اس پر زبان ہلانا خطرے سے خالی نہیں۔ بندہ کیا ہے اس کو اپنا حال معلوم ہے۔ لیکن حضرت بہادر بابا رحمۃ اللہ علیہ کی ہمارے سلسلے کے ایک صاحب کو زیارت ہوئی کہ شبیر بزرگوں کی کتابیں پڑھا رہا ہے، اچھی بات ہے، یہ ہمارے بھی بزرگ ہیں لیکن اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ بس اس کو بندہ نے اپنے لئے محبت سے بھرا ایک شکوہ یا تازیانہ محسوس کیا اور اس بظاہر ناممکن حد تک مشکل کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اور پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وہ برکت سامنے آئی جس کی تشریح ممکن نہیں کہ اس میں تشریح میں نہیں کرتا تھا بلکہ کروائی جاتی تھی اور میری حیثیت بھی تماشبین سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

اس کے بعد جو مضمون شامل کیا گیا ہے وہ معرفتِ الٰہی کے حصول کے بارے میں ہے۔ جس کی آج کل بہت ضرورت ہے۔ چند منطقی باتیں نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک خلقت کو لوگ اپنے صحیح عقائد سے برگشتہ کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ جس کا تدارک لازمی ہے۔ آج کل انٹرنیٹ اور موبائل نے ان کی اس مہم کو اور آسان کر دیا۔ اس لئے ہمیں بھی ہمہ وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ پس جو ان موضوعات میں پڑتے نہیں تو وہ تو محفوظ ہیں۔ ان کو ہم کہیں گے کہ ان کو نہ پڑھو۔ لیکن جو پڑھتے ہیں یا پڑھ چکے ہیں ان کے سامنے اپنے اکابر کی تشریح لانا اشد ضروری ہے۔ یہ مضمون اس کوشش کی ایک کڑی ہے۔

حمد باری تعالی

یاد دل میں بسی ایسی تیری
صرف نظروں میں ہے ہستی تیری

تری ہستی کے سامنے ہیچ ہیں سب
سب پہ لازم ہے بندگی تیری

تجھ پہ ایماں ہو تجھ سے ڈرنا ہو
کتنی آساں ہے دوستی تیری

میں کیا ہوں کیا میرا ہوگا
چیزیں میری جو ہیں وہ بھی تیری

جو بھی مر مٹ کے تیرا بن جائے
نگہبان اس کی خدائی تیری

ہر کسی کو خوشی اپنی محبوب
مجھ کو محبوب ہے خوشی تیری

جو نہ پایا تجھے تو کیا پایا
کتنی پر لطف آگہی تیری

آنکھیں اندھی ہیں اس کی جس نے بھی
خود کو دیکھا شان نہ دیکھی تیری

کان دونوں ہی اس کے بہرے ہیں
بات سن کر بھی نہ سنی تیری

دل اس کا دل نہیں ہے پتھر ہے
جس نے بھی بات نہ سمجھی تیری

اس کی تعریف پہ شبیرؔ
زہے قسمت، ہے شاعری تیری

نعت شریف

اپنے آقا کی تعریف کیسے کروں اس کے کرنے کو میری زباں ہی نہیں
جس کسی دل میں ان کی محبت نہ ہو ایک پتھر ہی ہے اس میں جاں ہی نہیں

وہ ہے محبوبِ ربِّ کریم مصطفٰے
وہ کہ مظہر ہدایت کے ہیں مجتبٰے
تو مری اب زباں پہ ہو صل علٰی

اب درود و سلام میں ہمیشہ پڑھوں، دل سے میں ہر جگہ صرف یہاں ہی نہیں

ہیں سراپا وہ رحمت ہمارے لئے
ان کا رستہ ہدایت ہمارے لئے
منبع فیض و حکمت ہمارے لئے

جو کبھی بھی جدا ہو گیا ان سے تو اس کے بچنے کا کوئی مکاں ہی نہیں

اب بھی ملتا ہے ان کی نظر کے طفیل
ان کی تعلیمِ دیں پُر اثر کے طفیل
ہے بشر زندہ خیر البشر کے طفیل

نام لیوا اگر نہ رہے ان کا تو پھر خدا کی قسم یہ جہاں ہی نہیں

پڑھ کے سیرت میں ان کی ہی ، انساں بنوں
ان کے پیچھے رہوں مرد میداں بنوں
ان کو میں چھوڑ کر کیسے حیراں بنوں

گر محبت نہ حاصل ہو ان کی شبیرؔ، تو کہوں یوں کہ پھر تو ایماں ہی نہیں

مختصراتِ سلوک

تصنیف

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

عشق سے عشق تک کا سفر

روح اللہ تعالیٰ کی عاشق تھی لیکن جسم میں آئی تو نفس سے پالا پڑا۔ نفس میں چونکہ فجور کے تقاضے فطرتاً موجود ہوتے ہیں جن کی مخالفت تقویٰ ہے۔ اس لئے نفسانی خواہشات دل کو گھیر لیتی ہیں اور اس پر اثر انداز ہو جاتی ہیں اس لیے روح بھول جاتی ہے کہ میں کس کی عاشق تھی بلکہ وہ ان نفسانی تقاضوں کو پورا کرنے والی چیزوں کی عاشق ہو جاتی ہے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللہ۔ اس کو دنیا کی محبت کہتے ہیں جس کو حدیث شریف میں ساری خطاؤں کی جڑ فرمایا ہے۔ اگر یہی رہے تو تباہی یقینی ہے۔ اس سے بچنے کے لئے دل سے اس کو نکالنا ہے لیکن چونکہ یہ آئی نفس سے ہوتی ہے اس لئے جب تک نفس قابو میں نہیں آئے گا اس وقت تک دل صاف نہیں ہو سکتا جیسا کہ فرمایا ''وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا''۔ پس اصل محنت تو نفس پر ہونی ہے لیکن جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ'' اس لئے دل کا اتنا بننا کم از کم ضروری ہے کہ نظامِ ہدایت کے لئے راستہ بن جائے کیونکہ ہدایت کے نظام کا محرک دل کے ساتھ ہوتا ہے لیکن دل تب کام کرے گا جب اس کو اپنے مطلوب کا پتا چلے گا کہ وہ اللہ ہے۔ اس کے لئے ذکر، مراقبہ و شغل، جو فاعلات کہلاتے ہیں، کے ذریعے دل کو جگایا جاتا ہے۔ جب دل جاگ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو وہ پھر سے اللہ تعالیٰ کا عاشق ہو جاتا ہے اسی کو جذبِ کسبی کہتے ہیں۔ اس وقت روح نفس کی قید کو محسوس کر کے پھڑ پھڑانا شروع کر لیتی ہے اور آزادی کے لئے ہاتھ پیر مارنا شروع کر لیتی ہے۔ شیخ کامل اس سے فائدہ اٹھا کر مجاہدات کے ذریعے جن کی برداشت سالک کو اس وقت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے نفس کی اصلاح کرتا ہے۔ اگر اس میں سالک کامیاب ہو جائے تو سلوک بھی طے ہوا اور سیر الی اللہ بھی۔

اس کے بعد روح آزاد ہو کر اپنے مقام پر پہنچ جاتی ہے جس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ سالک کو فضائل حاصل ہو جاتے ہیں جیسے اخلاص، توحید وغیرہ۔ اور نفس اپنے مقام عبدیت پر پہنچ جاتا ہے جس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کے رذائل دب جاتے ہیں۔اس کے بعد قلب روح کے ذریعے ملاء اعلیٰ سے لینے لگتا ہے اور اس کی عقل بھی ملاء اعلیٰ کے ساتھ مل کر سِر کا روپ دھار لیتی ہے اور دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ کا بن کر اس کے مطابق سوچتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو باقی لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بھی بنایا جاتا ہے جس کے بعد وہ منتہی مرجوع کہلاتا ہے اور اگر جذب کے حصول پر مطمئن ہو کر نفس کی اصلاح نہیں کروائی تو مجذوب متمکن ہو کر محروم ہو جاتا ہے۔

مکتوباتِ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ

دفتر دوم مکتوب نمبر 50

تشریح و ترتیب

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

متن

مرزا شمس الدین کی طرف صادر فرمایا۔ اس بیان میں کہ شریعت کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ اور اس بیان میں کہ اول سے آخر تک شریعت کے بغیر چارہ نہیں اور تمکینِ قلب، اطمینانِ نفس اور اجزائے قالب کے اعتدال کے بیان میں جو مرتبۂ نبوت میں ہے اور اس کے مناسب بیان میں۔

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصْطَفٰی۔ شریعت کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ شریعت کی صورت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور تمام احکامِ شرعیہ پر جو اُس (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے آئے ہیں ان پر ایمان لانا ہے اور باوجود نفسِ امارہ کی مزاحمت اور اس کی سرکشی، بغاوت اور انکار کے جو اس کی جبلت (عادت) میں رکھی ہوئی ہے احکامِ شرعیہ کا بجا لانا ہے۔ اس مقام پر اگر ایمان ہے تو وہ ایمان کی ظاہری صورت ہے اور اگر نماز ہے تو وہ بھی نماز کی ظاہری صورت ہے اور اگر روزہ ہے تو وہ بھی روزہ کی ظاہری صورت ہے، اسی پر دوسرے تمام احکامِ شرعیہ کو قیاس کرنا چاہیے۔ کیونکہ وجودِ انسان میں نفس ایک عمدہ جُز ہے۔ اور ''انا'' کے قول سے ہر فرد کا مُشارٌ الیہ بھی یہی (نفس) ہے جو اپنے کفر و انکار پر ڈٹا ہوا ہے، لہٰذا ایمان کی حقیقت اور اعمالِ صالحہ کی حقیقت کیونکر متصور ہو سکتی ہے۔

اور یہ رحمتِ خداوندی جل سلطانہٗ ہے کہ محض صورتِ (ایمان و اعمال) کو قبول فرما کر جنت میں داخل ہونے کی بشارت دے دی جو اس تعالیٰ کی رضا کا مقام ہے، اور یہ بھی اس اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے نفسِ ایمان میں صرف تصدیقِ قلب پر کفایت فرمائی ہے اور نفس کے اذعان (فرمانبرداری) کی تکلیف نہیں دی۔ ہاں جنت کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔

تشریح

یہاں سے اصل بات شروع ہوتی ہے۔ بڑی عمدہ بات ہے۔ اصل میں یہ بات یعنی جنت کی نعمتوں کی صورت اور حقیقت کی بات میں نے کبھی نہیں پڑھی جو ابھی حضرت فرمارہے ہیں۔ اس سے میرے بہت زیادہ اشکالات دور ہو گئے۔ الحمدللہ۔

متن

اصحابِ صورت (اربابِ ظاہر) جنت کی ظاہری شکل و صورت سے بہرہ ور ہوں گے اور اربابِ حقیقت، جنت کی حقیقت سے۔ اصحابِ صورت اور اربابِ حقیقت، دونوں جنت کے ایک ہی قسم کے میوے اور پھل کھائیں گے مگر صاحبِ صورت اس سے ایک طرح کی لذت پائیں گے اور صاحبِ حقیقت دوسری طرح کی لذت محسوس کریں گے۔

ازواجِ مطہرات امہات المؤمنین آں سرورِ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایک ہی جنت میں ہوں گی اور ایک ہی قسم کے پھل تناول فرمائیں گی لیکن ہر ایک کے لیے لذت اور نعمت کی کیفیت جدا جدا ہو گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ بات لازم آتی ہے کہ امہات المؤمنین ہمارے پیغمبر علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد تمام بنی آدم سے افضل ہیں۔ اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو شخص کسی سے افضل ہو تو اس کی زوجہ بھی اس دوسرے شخص سے افضل ہو۔ کیونکہ زوجہ اپنے خاوند کے ساتھ خلط ملط رہتی ہے۔ شریعت کی یہ (ظاہری) صورت بشرطِ استقامت فلاح کی موجب اور نجاتِ اخروی کو مستلزم ہے اور جنت میں داخل ہونے کے لیے اس کو صحیح قرار

دیا گیا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور جب شریعت کی صورت درست کر لی تو ولایتِ عامہ حاصل ہو گئی۔

تشریح

اس میں میرا ایک بہت بڑا اشکال دور ہو گیا۔ وہ یہ ہے کہ ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ الۡجَنَّۃَ''تو سب کے لیے ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہے۔ پھر شریعت پر عمل بھی سب کے لیے ہے۔ تو جو حضرت تھانوی ؒ نے فرمایا ہے کہ عارف کی دو رکعت کی نماز غیر عارف کی لاکھوں رکعتوں سے افضل ہے، تو وہ کیا چیز ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے کہ معرفت سے شریعت کی حقیقت نصیب ہو جاتی ہے، جبکہ مزید معرفت حقیقت کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ تو جب یہ مل گئی تو اس کے بعد جو صورت والی چیز تھی، اس سے ترقی کر کے حقیقت والی چیز تک پہنچ گیا۔ تو اس وجہ سے وہاں جو چیزیں ملیں گی تو صورتاً تو ایک جیسی ہوں گی، لیکن حقیقتاً ہر ایک کے لیے اُس کی معرفت اور حقیقت کے مطابق ہوں گی۔ جتنی جتنی کسی کی معرفت ہے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جس طرح اصحابِ صورت شریعت کی صورت پر عمل کرتے ہیں اور شریعت کے صورتاً نتائج محسوس کرتے ہیں۔ اسی طریقے سے وہاں جو پھل ہیں صورتاً گویا کہ ایک جیسے ہیں، لیکن حقیقتاً چونکہ مختلف ہیں لہٰذا ہر ایک اپنی اپنی حالت کے مطابق اس سے استفادہ کرے گا۔ ''اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' یہ دو جگہ پر مختلف طریقے سے آیا ہے: ''اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُھُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ''۔

یہاں پر تقویٰ کا ذکر نہیں ہے اور ''اَلَآ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ''۔ یہاں پر تقویٰ کا ذکر ہے اور پھر تقویٰ جو ہے ''اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ''۔ یعنی تم میں اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ معزز وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ متقی ہے۔

تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جو حقیقت ہے وہ تو تقویٰ کے رُخ پر ہے۔ کیونکہ جتنی جتنی کسی کے اوپر حقیقت کھلتی ہے، اتنا اتنا اس کو تقویٰ نصیب ہو گا۔ اتنی اتنی اللہ تعالیٰ کی قربت نصیب ہو گی۔ اتنا اتنا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا مقام بنے گا۔

تو ''اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا''۔ اس میں تو سارے ایمان والے آ گئے۔ لیکن جو

تقویٰ کا معیار ہے وہ ہر ایک کا اپنا اپنا ہے۔ لہٰذا اس کے حساب سے ان کو تولا جائے گا۔

متن

اور اس وقت اللہ سبحانہٗ کی عنایت سے سالک اس امر کی استعداد پیدا کر لیتا ہے کہ طریقت میں قدم رکھے اور ولایتِ خاصہ کی طرف متوجہ ہو اور نفس کو آہستہ آہستہ سرکشی سے اطمینان کی طرف لائے۔

تشریح

یعنی ایمان کے بعد دو steps اور ہیں۔ایک اعمال ہیں اور ایک اعمال کے اندر جان ہے۔ یعنی کیفیتِ احسان ہے۔ لہٰذا اگر صرف ایمان رہ گیا تو اعمال کا مطالبہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر اعمال ہیں تو اس میں جو جان ہے اس کا بھی مطالبہ ہو سکتا ہے اور میدانِ عمل چونکہ صرف یہاں ہے۔ وہاں تو نہیں ہے۔ وہاں تو صرف تولا جائے گا۔ لہٰذا پہلے سے ہی اپنا ذہن اس کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ جس جس چیز کا مطالبہ وہاں پر ہو گا، اس کے لیے تیاری ہم یہاں کر لیں۔

متن

لیکن جاننا چاہیے کہ ولایتِ خاصہ تک منازل کا طے کرنا بھی اعمالِ شریعت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ذکرِ الٰہی جل شانہٗ جو اس راہ کا عمدہ طریقہ ہے وہ ماموراتِ شرعیہ میں سے ہے اور مناہی شرعیہ سے بچنا بھی اس راہ کی ضروریات میں سے ہے اور فرائض کی ادائیگی (حق تعالیٰ کا) مقرب بناتی ہے اور راہ بیں و راہ نما (راستے کا جاننے والا اور راستہ دکھانے والا) پیر و مرشد کی تلاش بھی جو وسیلہ ہو سکے مامورِ شرعی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ''۔

تشریح

حضرت نے اس آیت سے کیسے عمدہ استدلال فرمایا ہے ''وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ''۔ یعنی اس کے لیے وسیلہ تلاش کرو۔

مختصر یہ کہ شریعت کے بغیر چارہ نہیں ہے خواہ شریعت کی صورت ہو یا شریعت کی حقیقت۔ عمل تو سب نے شریعت کے مطابق کرنا ہے کیونکہ شریعت ہی کی صورت سب پر کھلی ہے۔ اور شریعت کی حقیقت تو ہر ایک پر حسبِ ظرف ہی کھلتی ہے۔ جتنا جس کا ظرف ہے اتنی اتنی اس کے اوپر حقیقت کھلتی ہے۔ لہٰذا بعض دفعہ جو اہلِ حقیقت ہوتے ہیں تو ظاہر صورتاً شریعت والے ان کا مذاق بھی اڑا لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کہاں کی باتیں کر رہا ہے، اصل میں وہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ شریعت کے ساتھ اس کی حقیقت بھی ہوتی ہے۔

مکتوبات کی حقیقت، قرآن و حدیث کی تشریح

مثال کے طور پر میں اپنی ایک بات بتاؤں۔ مجھے ایک شیخ نے کہا کہ شاہ صاحب! آپ قرآن پاک کا درس کیوں نہیں دیتے؟ آپ حدیث شریف کا درس کیوں نہیں دیتے؟ قرآن کے مقابلے میں اور حدیث کے مقابلے میں مکتوبات شریف کی کیا حیثیت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جب قرآن کا درس دیا جاتا ہے تو اس کا ایک ترجمہ ہوتا ہے اور ایک تفسیر ہوتی ہے۔ تلاوت تو سب ہی جانتے ہیں۔ اب جو صاحب جتنا عالم ہوتا ہے وہ تفسیر اتنی گہرائی سے کرتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کی تفسیر کرتے کرتے اس پر لوگ کافی وقت لگا دیتے ہیں اور اس طرح ہر ایک آیت کی تفسیر پر کافی وقت لگاتے ہیں۔ اور اس کو علم کی نشانی سمجھا جاتا ہے کہ وہ کتنی گہرائی میں اس کو لیتا ہے۔ تو میں نے عرض کیا کہ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تو یہی کرتے ہیں۔ وہ ہمیں قرآن ہی پڑھاتے ہیں، لیکن اس کی تشریح کے ساتھ، تفصیل کے ساتھ، گہرائی کے ساتھ جیسا کہ ابھی ''وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ'' کی تفسیر آئی۔ ایسا ہی دوسری آیات کریمہ جو ابھی آ رہی ہیں، ان کی تفسیر بھی کرتے ہیں تو یہ قرآن ہی کا درس ہے۔ اسی طرح اس میں احادیث شریف آ رہی ہیں، تو احادیث شریف کی تشریح بھی آتی ہے۔ اب مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک علم بھی ہے کیونکہ عالم تو تھے ہی اور ساتھ ساتھ صاحبِ کشف بھی تھے، صاحبِ بصیرت تھے، صاحبِ دل تھے۔ اب ان کے اُوپر اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کی حقیقتیں کھولی ہوئی تھیں، اب وہ جو تفسیر کرتے ہیں۔ کیا اس طرح تفسیر ہم کر سکتے ہیں؟ یا کوئی اور کر سکتا ہے؟ تو عرض کیا کہ میں اگر ان کی چیزیں پڑھاتا ہوں تو یہ تفسیر ہی ہے۔ جیسے اگر میں

معارف القرآن سے پڑھاتا ہوں تو وہ بھی تفسیر ہے تو اسی طرح مکتوبات شریف بھی تفسیر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اس کی ذمہ داری اپنے سر کیوں لوں جس کا میں اہل نہیں ہوں۔ تو حضرت نے جو فرمایا ہے اگر میں وہی باتیں آپ کو بتاؤں تو کیا یہ اچھی بات نہیں ہے؟

علماء و مشائخ کی تحقیقات کے بارے میں سطحی سوچ

میرے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھی ہیں۔ میرے بڑے اچھے ساتھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے۔ ایک دن مجھے کہا کہ آپ کونسی پکڈنڈیوں میں پھنس گئے ہو، بھئی اس پورے سمندر میں آجاؤ، یہ ساری پکڈنڈیاں ہیں۔ تو میں ہنس پڑا کہ میں اس کو کیسے سمجھاؤں؟ کوئی بتائے کہ سکول میں پڑھنے والے زیادہ علم رکھتے ہیں یا پی ایچ ڈی کرنے والے؟ حالانکہ پی ایچ ڈی تو narrow field کا علم اور ریسرچ ہوتی ہے تو اس لحاظ سے پکڈنڈی ہوئی۔ جب تک طریقت کی پکڈنڈی پر نہ جائیں تو دین کے کام کی حقیقت نصیب نہیں ہوتی، پھیلاؤ تو ہو گا لیکن گہرائی نہیں ہو گی۔ اسی لیے تبلیغ کے سارے بڑے بزرگوں نے پہلے اسی پکڈنڈی کو طے کیا پھر اللہ پاک نے ان سے تبلیغ کی خدمت لی۔ ایسی بات تکبر میں شمار ہوسکتی ہے۔ دوسروں کے دینی کام کو چھوٹا سمجھنا اور اپنے عمل کو بڑا سمجھنا تکبر میں آتا ہے۔ امام اہلِ سنت مولانا سرفراز صفدر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں تبلیغی جماعت آئی۔ حضرت نے ماشاءاللہ بڑا اکرام کیا۔ اس جماعت کے کسی ساتھی نے حضرت سے کہہ دیا کہ حضرت! یہاں دین کا کام کب ہوتا ہے؟ حضرت کو اس بات کا اس قدر رنج ہوا کہ رائیونڈ کے بزرگوں کو حضرت کے پاس آکر منانا پڑا۔

متن

مختصر یہ کہ شریعت کے بغیر چارہ نہیں خواہ شریعت کی صورت ہو یا شریعت کی حقیقت۔ کیونکہ ولایت و نبوت کے تمام کمالات کی اصل و بنیاد "احکامِ شرعیہ" ہیں۔ ولایت کے کمالات، صورتِ شریعت کے نتائج ہیں اور نبوت کے کمالات، حقیقتِ شریعت کے ثمرات ہیں، جیسا کہ اِن شاءاللہ تعالیٰ عنقریب بیان کیا جائے گا۔ ولایت کا مقدمہ طریقت ہے،

جہاں ماسوا (غیرِ حق) کی نفی مطلوب ہے اور غیر و غیریت کا دور کرنا مقصود ہے۔ اور جب فضلِ خداوندی جل شانہٗ سے ماسوا (غیرِ حق) بتمام و کمال نظر سے زائل ہو گیا اور دید میں اغیار کا نام و نشان باقی نہ رہا تو فنا حاصل ہو گئی اور طریقت کا مقام انجام کو پہنچ گیا اور سیر الی اللہ مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد مقامِ اثبات (اِلَّا اللہ) شروع ہوتا ہے جس کو سیر فی اللہ سے تعبیر کرتے ہیں اور بقا کا یہی مقام ہے جس کو مقامِ حقیقت کہتے ہیں جو ولایت کا اعلیٰ مقصد ہے۔ اس طریقت و حقیقت پر جس کو فنا و بقا سے تعبیر کیا جاتا ہے ولایت کا نام صادق آتا ہے اور نفسِ امارہ نفسِ مطمئنہ بن جاتا ہے اور اپنے کفر و انکار سے باز آ جاتا ہے اور اپنے مولیٰ حق جل سلطانہٗ سے راضی ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے۔

تشریح

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک بات کھول دی۔ سلوک کی معروف اصطلاحات سیر فی اللہ یا بقا باللہ کو ہم نے طریقِ صحابہ کا نام دیا ہے۔ تو طریقت تو ایک ہی ہے۔ اگرچہ مقام ان کا اونچا ہے۔ صحابہ کے مقام تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن طریق تو وہی ہے۔ چیز تو وہی ہے، تو اس لیے طریقِ صحابہ بھی مقامِ رضا سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی چونکہ سیر الی اللہ میں تکمیل جب ہو جاتی ہے، فنائیت ہو جاتی ہے، اس کے بعد بقا بھی مل جاتی ہے، تو اس کے بعد جتنا کام ہے وہ تو بقا باللہ کے ساتھ ہے۔ اسی کو طریقِ صحابہ کہتے ہیں۔ تو طریقِ صحابہ کے لیے ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ'' آیا ہے۔ صحابہ کے لیے کیا ہے: ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ''۔ اور یہاں ''یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً'' بھی ہے۔ تو دونوں کا گویا رنگ ایک جیسا ہے کیونکہ صحابہ کو تو یہ بشارت آپ ﷺ کی صحبت کی وجہ سے ملی ہے اور ہمیں سلوک طے کرنے کے بعد یعنی مقام رضا حاصل کرنے کے بعد جو نفس مطمئنہ حاصل ہوتا ہے اس کے ساتھ۔ یعنی اس سلوک کا نتیجہ بھی ''رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً'' اور یہاں پر بھی ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ'' گویا کہ اس کو آپ طریقِ صحابہ اس معنی میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ'' جو صحابہ کا شعار ہے وہ نفسِ مطمئنہ کے بعد، ''رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً'' کے

ذریعے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب آگے جتنا بھی ہے، وہ اس کے ساتھ مزید مقامات طے کرنا ہے۔

متن

اور نفس امارہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اور اپنے کفر و انکار سے باز آجاتا ہے اور اپنے مولیٰ حق جل سلطانہٗ سے راضی ہو جاتا ہے اور مولیٰ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اور وہ (نفس) جو اپنی سرشت میں (احکامِ شرعیہ سے) کراہت رکھتا تھا وہ بھی زائل ہو جاتی ہے۔ (مشائخ) کہتے ہیں اگرچہ نفس مقامِ اطمینان میں پہنچ جاتا ہے لیکن اپنی سرکشی سے باز نہیں آتا۔

ہرچند کہ مطمئنہ گردد ہر گز صفاتِ خود نہ گردد

(نفس گر مطمئنہ بھی ہو جائے سرکشی سے وہ باز کب آئے)

تشریح

آگے بہت عجیب و غریب نکتہ ہے۔

متن

اور "جہادِ اکبر" کہ جس کا ذکر آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیث شریف میں فرمایا ہے: "رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ" (اب ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف آتے ہیں) اس سے مراد جہاد بالنفس ہے۔ اور جو کچھ کہ فقیر کے کشف میں آیا ہے اور وجدان سے پایا ہے وہ (مشائخ) کے اس مشہور بیان کے خلاف ہے (یعنی یہ فقیر) اطمینان حاصل ہونے کے بعد نفس میں کسی قسم کی سرکشی نہیں پاتا اور نفس فرمانبرداری کے مقام میں معلوم ہوتا ہے بلکہ نفسِ مطمئنہ کو قلبِ متمکن کی طرح ماسوا کو فراموش کیا ہوا پاتا ہے کیونکہ نفس اب غیر و غیریت کی دید و دانش سے گزر چکا ہوتا ہے اور حب جاہ و ریاست اور لذت و الم سے خلاصی پا چکا ہوتا ہے لہٰذا اس میں مخالفت کہاں رہی

اور سرکشی کس سے۔ اطمینان حاصل ہونے سے پہلے اگرچہ سرِ مو اختلاف کے متعلق جو کچھ کہا جائے وہ سرکشی اور طغیان کی گنجائش رکھتا ہے لیکن اطمینان حاصل ہونے کے بعد مخالفت اور سرکشی کی گنجائش نہیں۔ فقیر نے اس بارے میں بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس معمہ کے حل میں دور تک گیا ہے لیکن اللہ سبحانہٗ کی عنایت سے ان حضرات کی مقررہ بات کے خلاف ہی پایا، اور نفسِ مطمئنہ میں بال برابر بھی مخالفت و سرکشی نہیں پائی اور اس میں اپنے استہلاک و اضمحلال (ہلاکت و نیستی) کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں پائی۔ اور جب نفس خود کو اپنے مولائے جل سلطانہٗ پر قربان کر دے تو پھر مخالفت کی کیا گنجائش رہتی ہے۔

تشریح

نفس اور جبلت یا قالب میں فرق

یہ پہلے بھی الحمدللہ ہمارے ہاں discuss ہو چکا ہے اور یہ سمجھنے کے لحاظ سے بہت اہم مضمون ہے۔ اس کی تشریح آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ ایک ہے نفس اور ایک ہے جبلت۔ جبلت بھی انہی عناصر سے مرکب ہے جن سے نفس مرکب ہے۔ لیکن نفس اس میں مظروف (contained) ہے اور جبلت ظرف (container) ہے۔ تو ظرف تو ختم نہیں ہوتا۔ لیکن نفس جو کہ مظروف ہے، اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ البتہ جو ظرف ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ ظرف اپنی حالت پر رہتا ہے۔ میں اس کو اس معنٰی میں لیتا ہوں کہ پٹھان چاہے کتنا بڑا بزرگ ہو جائے، پٹھانیت اس کی ختم نہیں ہوتی اور پنجابی چاہے کتنا بھی بڑا بزرگ بن جائے، اس کی پنجابیت ختم نہیں ہوتی۔ اس طرح عرب چاہے کتنا بڑا ہو جائے، اس کی عربیت اپنی جگہ ہوتی ہے اور اسی طرح عجمیت کا ہے۔ یہ جبلت ہے۔ یہ تبدیل نہیں ہو گی۔ جب یہ جبلت موجود رہتی ہے تو نفس کی اصلاح چونکہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جو نفس کی وجہ سے شریعت کے ساتھ مقابلہ تھا وہ ختم ہو گیا البتہ جبلت اپنی جگہ قائم رہتی ہے اس کی وجہ سے شریعت کے جو کام مشکل محسوس ہوتے ہیں وہ تو رہیں گے اس لئے ان کا کرنا مجاہدہ ہو گا اور اس پر اجر ملے گا۔ یہی مجاہدہ عمر بھر کے لئے برقرار رہے گا۔ مثلاً پٹھان کے اندر تو غصہ فطری ہے۔ وہ چاہے آپ کچھ بھی کریں۔ غصہ اُس کو آئے گا۔ اب اس کو کنٹرول کرنا

ہمیشہ کے لیے اس کی ذمہ داری ہے، تو کرے گا۔ اور پنجابی کے اندر مصلحت فطری ہے، وہ مصلحت کی کوشش کرے گا۔ تو اب ظاہر ہے غلط مصلحت سے بچنا اس کی ذمہ داری ہو گی، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ تو جب یہ والی بات ہے۔ تو یہ جبلت چونکہ اخیر تک رہتی ہے تو اس وجہ سے مجاہدہ بھی اخیر تک رہتا ہے۔ اس وجہ سے اجر بھی اخیر تک رہتا ہے۔ اجر مجاہدے سے ملتا ہے۔

کیا گاڑی چلانے کے لیے بالکل ہموار زمین چاہیے، شیشے کی طرح؟ نہیں۔ تو کیسی چاہیے؟ وہ جس سے کچھ مزاحمت ہو۔ ہاں اتنی بھی نہ ہو کہ جیسے پتھروں پر چل رہے ہوں۔ اس میں تو پھر low gear میں چلنا پڑتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ بالکل ہی شیشہ ہو جائے تو پھر آپ کا سٹیرنگ آپ کے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ آپ ایک طرف موڑیں گے اور گاڑی دوسری طرف جائے گی۔ تو آپ کی گاڑی کی بچت اس کی resistance میں ہے۔ بیشک اس میں فیول خرچ ہوتا ہے لیکن حفاظت اسی میں ہے ورنہ بریک کیسے لگے گی۔ اگر سارے اس طرح ہو جائیں؟

تو یہ جو بات ہو رہی ہے کہ جو جبلت ہے وہ ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جبلت ہی سے تو آپ کی مزید ترقی ہے۔ لیکن وہ ایک مستقل کشمکش تو ہے۔ تو اس کشمکش کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا، control کیا جا سکتا ہے۔ اور اس control پر ہی آپ مکلف ہیں، ختم کرنے پر مکلف نہیں ہیں۔ ختم کرنے پر ہم مکلف نہیں ہیں۔ اس کے کنٹرول پر مکلف ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ مشائخ ازالہ نہیں کرتے، امالہ کرتے ہیں۔ یعنی اس کا صحیح محل وہ سمجھا دیتے ہیں، اور اسی کے مطابق اس کا عمل کر لیتے ہیں۔

متن

اور جب نفس حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ سے راضی ہو گیا اور حضرت حق سبحانہُ و تعالیٰ اس سے راضی ہو گیا تو طغیان کی کیا صورت باقی رہ گئی، کیونکہ یہ بات ''رضا'' کے منافی ہے کہ جو حق جل شانہٗ کی مرضی ہو وہ ہرگز نامرضی نہیں ہو سکتی۔ اور (فقیر کے نزدیک) ''جہادِ اکبر'' سے مراد یہی ہے۔ ''وَاللّٰہُ سُبْحَانَہ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ''۔ (اور اللّٰہ سبحانہُ ہی حقیقتِ حال سے خوب واقف ہے)۔ بہت ممکن ہے کہ جہاد با قالب (بدنِ عنصری) کے ساتھ ہو جو مختلف طبیعتوں سے مرکب ہے اور اس کی ہر طبیعت کسی

ایک امر کی خواہاں ہے اور دوسرے امر سے گریزاں۔ اگر قوتِ شہوانی ہے تو وہ بھی قالب (بدنِ عنصری) سے پیدا ہوتی ہے۔

تشریح

بعض لوگوں میں فطرتاً شہوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ تو ہمیشہ مجاہدے میں رہیں گے۔ لیکن اس کے فوائد بھی بہت زیادہ ہیں۔

متن

اور اگر قوتِ غضبیہ ہے تو اس کا بھی وہیں سے پیدا ہونا ظاہر ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمام حیوانات جو نفسِ ناطقہ نہیں رکھتے ان میں بھی یہ رذیلہ عادتیں موجود ہیں اور شہوت و غضب اور غلبۂ حرص ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔

تشریح

ہم مدینہ منورہ جارہے تھے، راستے میں ایک جگہ بندر بہت زیادہ ہیں۔ تو ڈرائیور بھی بعض دفعہ اُن کے لیے گاڑی روک دیتے ہیں، اس دفعہ بھی روکا۔ تو وہ جو بندر ہوتے ہیں ان کو عادت ہوتی ہے، وہ بھی بس کے قریب آ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کیلے پھینکتے ہیں، کوئی بسکٹ پھینکتا ہے، کوئی کیا کرتا ہے، کوئی کیا کرتا ہے۔ تو ایسا ہوا کہ ایک بڑا بندر تھا، کسی نے کیلے پھینکتے تو اس نے جھپٹا مارا اس پر۔ جتنے تھے وہ سارے اپنے قبضے میں کر لیے اور اس کے سامنے ایک مریل سی بندریا تھی اور ایک چھوٹا سا بچہ، وہ اس طرح حسرت سے اس کو دیکھ رہے تھے اور وہ بڑے مزے سے ان کو چھیل چھیل کر کھا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یعنی بندروں میں ہم سے بہت ساری چیزیں مماثل تو ہیں، تو اس میں یہ ہے کہ وہ ان کے سامنے کھا رہا تھا اور ان کو ترسا رہا تھا۔ تو ان کے اندر کہاں سے نفس آ گیا؟ بس وہی جبلت ہی ہے۔ اپنی جبلت کے مطابق چلتے ہیں۔

متن

یہ جہاد دائمی طور پر برپا ہے۔ نفس کا اطمینان اس جہاد سے تسکین نہیں کرتا اور اطمینانِ قلب اس جہاد کو ختم نہیں کرتا۔ اس جہاد کی بقا میں

بہت سے فائدے ہیں کیونکہ یہ قالب کے تنقیہ و تطہیر میں کام آتے ہیں، تاکہ اُس جہان کے کمالات اور آخرت کا معاملہ باصالت (براہ راست) اس کے ساتھ وابستہ ہو۔ چونکہ اس دنیا کے کمالات میں قالب (بدن عنصری) تابع ہے اور قلب متبوع ہے اور وہاں (آخرت میں) معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی قلب تابع ہے اور قالب متبوع۔ اور جب اِس دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور وہ جہان پر تو ڈالے گا تو یہ جہاد بھی تمام ہو جائے گا اور یہ قتال انجام کو پہنچ جائے گا۔ اور جب اللّٰہ سبحانہُ کے فضل سے نفس اطمینان کے مقام میں آ گیا اور حکمِ الٰہی جل شانہُ کا فرمانبردار بن گیا تو اسلامِ حقیقی میسر ہو گیا۔

تشریح

کیونکہ مقامِ رضا سے پہلے مقامِ تسلیم ہے۔ تو مقامِ تسلیم وہ مقام ہے جس میں انسان حقیقی اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ گویا کہ نفس مان لیتا ہے کہ اصل چیز تو یہی ہے، تسلیم کر لیتا ہے،surrender کر لیتا ہے۔ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس وقت حقیقی اسلام میں داخل ہو گیا۔ پہلے ایمانی طور پر اسلام میں داخل ہو گیا تھا اور اس کے بعد جس وقت نفس کی اصلاح ہو جائے تو پھر انسان باقاعدہ establish ہو جاتا ہے۔ ایمان کی وہ حالت establish ہو جاتی ہے۔ اور یہ نفس گویا کہ مان لیتا ہے کہ ہاں اصل میں تو یہی چیز ہے۔اس کو کرنا ہے۔ تو تبھی تو مقامِ رضا پر چلا جاتا ہے۔ کیونکہ تسلیم کے ساتھ رضا ہے، تسلیم و رضا۔

متن

اور حقیقتِ ایمان کی صورت جلوہ گر ہو گئی، اس کے بعد جو کچھ بھی عمل میں آئے گا وہ حقیقتِ شریعت ہی ہو گا۔ اگر نماز ادا ہو گی تو وہ حقیقتِ نماز ہو گی اور اگر روزہ ہو گا تو وہ بھی حقیقتِ روزہ ہو گا اور اگر حج ہو گا تو وہ بھی حقیقتِ حج ہو گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ تمام احکامِ شرعیہ اسی قیاس پر ہوں گے۔ لہٰذا طریقت و حقیقت، صورتِ شریعت اور حقیقتِ شریعت کے درمیان واقع ہیں۔ (سالک) جب تک ولایتِ خاصہ سے مشرف نہ ہو

جائے اسلامِ مجازی سے اسلامِ حقیقی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور جب محض فضلِ خداوندی جل سلطانہُ سے شریعت کی حقیقت سے آراستہ ہو کر اسلامِ حقیقی میسر ہو گیا۔

تشریح

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ فضائل حج میں موجود ہے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے "فضائل حج "اس میں ہے کہ حضرت مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کوئی شخص آیا، اس نے حج کیا تھا۔ تو حضرت نے ان سے باقاعدہ پوچھا کہ تو نے فلاں وقت یہ محسوس کیا تھا؟ فلاں وقت یہ محسوس کیا تھا؟ فلاں وقت یہ محسوس کیا تھا؟ وہ کہتا تھا، نہیں ، نہیں۔ ہر چیز پر نہیں کہتا تھا۔ تو حضرت نے فرمایا کہ جاؤ دوبارہ حج کر آؤ، تو نے حج نہیں کیا۔ اب ظاہر شریعت کے مطابق تو اس کا حج ہو گیا تھا لیکن جو حقیقتِ حج تھی، حضرت کی نظر اُس پر تھی۔ تو فرمایا کہ جاؤ تیرا حج نہیں ہوا۔ مطلب تو نے حج نہیں کیا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ واقعتاً نماز کے اندر بھی ایسی چیزیں ہیں جب حقیقتِ نماز کسی کو مل جائے تو پھر اس کے بعد نماز کے ساتھ جو اللہ پاک کا تعلق حاصل ہوتا ہے، اس کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کے تعلق کا جوڑ ہے "وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" کے ضمن میں، تو وہ جب کسی پر کھل جائے تو وہ حقیقتِ صلوٰۃ ہے۔ چونکہ صحابہ کرام پر یہ حقیقت کھل گئی تھی، لہٰذا ہر چیز میں نماز کی طرف دوڑتے۔ آج کل یہ کہنا پڑتا ہے۔ بلکہ کہہ بھی دیں تو ذرا تھوڑا، تھوڑا۔ آگے پیچھے۔۔ کچھ اِدھر اُدھر کی بات۔۔ نہیں جی یہ، وہ۔ مطلب کچھ تعویذ دے دو، کچھ دم کر دو۔ کوئی اس طرف دوڑتے ہیں؟ نماز کی طرف تو شاید کسی کو خیال بھی نہ آئے۔

آج ایک خاتون نے مجھے فیصل آباد سے فون کیا۔ شاہ صاحب! یہ ہو گیا، وہ ہو گیا۔ کچھ حالات، پریشانیاں، بیماری۔ میں نے کہا، یہ جو آپ نے مجھے بات بتائی ہے ، اس کا تعلق ڈاکٹر کے ساتھ ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی بیماری بتائی تھی۔ پھر کہا کہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کسی وقت ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ تو میں نے کہا، یہ جو آپ نے حالات بتائے ہیں اس کا تعلق یا ڈاکٹر سے ہے یا عامل سے۔ میں نہ ڈاکٹر ہوں نہ عامل ہوں۔ تو آپ نے مجھے فون کیوں کیا؟ اُس نے بڑی حیرت سے پوچھا، پھر آپ لوگوں کو کارڈ کیوں دیتے ہیں؟ کس چیز کے لیے دیتے ہیں؟ یعنی

یہ اس کا بڑا زبردست شکوہ تھا کہ آپ پھر کارڈ کیوں دیتے ہیں؟ اول تو میں نے کارڈ دیا نہیں، پتا نہیں کس سے لیا ہے۔ وَاللہ اَعلَم۔ لیکن بہر حال اس کا شکوہ اپنی جگہ کہ پھر آپ یہ کارڈ کیوں دیتے ہیں؟ میں نے کہا، میرے بزرگوں نے ایک ڈیوٹی لگائی ہے کہ جو مرد اور خواتین اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہوں اور وہ اس سلسلے میں آتی ہیں یا آتے ہیں، ان کی خدمت کرتا ہوں۔ ہماری ڈیوٹی یہ لگی ہے۔ نہ ہماری بیماری کو ٹھیک کرنے کی ڈیوٹی لگی ہے اور نہ عملیات کی ڈیوٹی لگی ہے۔ یہ دونوں ہماری رینج سے آؤٹ ہیں۔ پھر اس کو خیال آیا، شاید وہ جانتی تھی تو مجھے کہتی ہے، آپ کا کونسا سلسلہ ہے؟ میں نے کہا، الحمدللہ-چشتی، نقشبندی، سہروردی، قادری، چاروں سلسلے ہیں۔ تو بہر حال انہوں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

مقصد میرا یہ ہے کہ لوگوں کا جو تاثر بنتا ہے وہ یہ بنتا ہے کہ اعمال کی طرف نہیں آتے اور اعمال کی حقیقت کی طرف تو ایک حِس بھی نہیں پائی جاتی، کہ جیسے کوئی ہوائی طور پر کوئی چیز آئے، وہ لگ جائے، وہ بھی نہیں۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ۔ یہ اللہ پاک فرماتے ہیں۔ بیشک نماز بے حیائی کی چیزوں سے اور منکر چیزوں سے روکنے والی ہے۔ اور ”وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ“ (اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بڑی چیز ہے)۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ کبھی ہم نے سوچا ہے کہ ہمارے اندر جو نقصانات و غلطیاں ہیں، برائیاں ہیں، کبھی اس پر غور کیا کہ ہماری نماز کامل نہیں ہے تو یہ ساری چیزیں اس وجہ سے ہیں؟ کبھی اس پر کسی نے بھی غور کیا ہے؟ اس طرف بالکل دھیان ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا صریح حکم ہے، صریح فرمان ہے، اس کے اندر کوئی درمیان میں ایسی چیز بھی نہیں کہ جس کی کوئی اور تشریح کی جا سکے۔ صاف صاف ہے۔ نماز کے لیے حکم تو ”وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ“ تو یہ تقریباً سات سو دفعہ آیا ہے، لیکن یہ جو علت بتائی ہے اس پر کبھی بھی کسی کا ذہن نہیں جاتا کہ اگر میرے اندر برائیاں ہیں تو میں اپنی نماز کو بہتر کر لوں، نماز کی حقیقت حاصل کر لوں۔ اگر میں نے نماز کی حقیقت حاصل کر لی تو نماز کے اندر جو اللہ نے فی الحقیقت رکھا ہے وہ مجھے مل جائے گا۔ تو اس حقیقت کو حاصل کرنے کی کوشش کے بارے میں کسی کے ذہن میں بات آتی ہی نہیں۔

متن

تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ کمالاتِ نبوت سے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی وراثت و تبعیت کے طور پر بہرہ ور ہو اور کامل حصہ پائے۔ چنانچہ صورتِ شریعت کمالاتِ ولایت کے لیے شجرۂ طیبہ کی مانند ہے اور کمالاتِ ولایت گویا اس شجرۂ طیبہ کے ثمرات ہیں۔ اور حقیقتِ شریعت بھی کمالاتِ نبوت کے لیے شجرۂ مبارکہ ہے اور یہ کمالات اس کے ثمرات کی مانند ہیں۔ اور جب کمالاتِ ولایت صورتِ (شریعت) کے ثمرات ہیں اور کمالاتِ نبوت اس صورت کی حقیقت کے ثمرات ہیں تو لازمی طور پر کمالاتِ ولایت بھی کمالاتِ نبوت کے لیے صورتوں کی طرح ہوں گے (یعنی صورتاً تو وہی ہوں گے، حقیقتاً فرق ہو گا)۔ اور کمالاتِ نبوت ان صورتوں کے حقائق ہوں گے۔

جاننا چاہیے کہ صورتِ شریعت اور حقیقتِ شریعت کے درمیان فرق نفس کی راہ سے آیا تھا جو ظاہری شریعت میں نفسِ امارہ سرکشی کی حالت میں اور اپنے انکار پر تھا اور حقیقت (شریعت) میں اب نفس مطمئنہ اور مسلمان ہو گیا ہے۔ اسی طرح کمالاتِ ولایت جو صورتوں کی مانند ہیں اور کمالاتِ نبوت کے درمیان جو حقائق کے مانند ہیں فرق قالب کی راہ سے ہے۔

تشریح

اس پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بہت بات کی ہے۔ اس کے لیے ایک اور لطیفہ کا تعارف کیا ہے، جس کو لطیفۂ جوارح کہتے ہیں حضرت نے باقاعدہ اس پر کافی تفصیل سے "الطاف القدس" میں بیان فرمایا ہے۔

متن

مقامِ ولایت میں قالب کے اجزا بغاوت و سرکشی سے باز نہیں آتے، مثلاً اس کا جزوِ ناری اطمینانِ نفس کے باوجود اپنے آپ کو اچھا سمجھتا ہے اور تکبر کرنے سے باز نہیں آتا اور جزوِ خاکی اپنی خست اور کمینگی سے پشیمان نہیں ہوتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس باقی تمام اجزاء کا معاملہ ہے۔ مگر کمالاتِ نبوت

کے مقام میں قالب کے اجزا بھی اعتدال پر آ جاتے ہیں اور افراط و تفریط سے نجات پا جاتے ہیں۔

تشریح

اصل میں یہ واقعی انبیاء کی معصومیت والی جو بات ہے وہ پھر سمجھ میں آتی ہے۔ تو حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور موقع پر اسی قسم کی بحث کی تھی۔ اس میں حضرت نے ارشاد فرمایا تھا کہ جیسے ابھی جبلت کی بات ہوئی، تو جبلت لوگوں کی تبدیل نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کو اجر جبلت کی وجہ سے ملتا ہے۔ جبلت کے خلاف مجاہدے سے ان کو اجر ملتا رہتا ہے۔ لیکن سوال اٹھایا گیا تھا کہ پھر انبیاء کے ساتھ کیا معاملہ ہے کیونکہ ان کی جبلت تو بالکل صحیح ہوتی ہے؟ ان کا معاملہ اعتدال پر ہے، ابھی بھی یہی فرما رہے ہیں۔ تو ان کو کس چیز پر اجر ملتا ہے؟ فرمایا، ان کو دوسروں کے کاموں پر جس سے ان کو تکلیف پہنچتی ہے، صبر کرنے اور اُن کی باتوں پر ان کو اجر ملتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی فرمایا گیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک انسان ہے، وہ اکیلا رہتا ہے اور مخلوق کی غلطیوں پر صبر نہیں کرتا، تو ظاہر ہے وہ اتنا اجر نہیں پاتا جتنا کہ لوگوں کے درمیان کوئی رہتا ہو اور ان کی غلطیوں پر صبر کرتا ہو۔ کیونکہ یہ نبوی شعبہ ہے۔ انبیاء کرام بھی اسی طرح لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرتے ہیں، لوگوں کی ناسمجھیوں پر صبر کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چونکہ یہ ساری چیز روزِ روشن کی طرح واضح تھی لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی تکلیف دیتا تو فوراً فرما دیتے، یا اللہ! یہ جانتے نہیں ہیں۔ جیسے وہ طائف کا واقعہ ہوا تھا۔ اور واقعتاً وہ بات صحیح ہے کہ اگر کوئی ان کو جانتا تو پھر وہ کیسے یہ کام کرتے۔ تو یہ والی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو ہوتے ہیں، وہ اس چیز کو چونکہ جانتے ہیں لہٰذا وہ مخلوق کی ایذاؤں پر صبر کرتے ہیں اور ان کو اس کا ہی ماشاء اللہ اجر ملتا رہتا ہے۔

متن

ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوۃ والسلام نے یہ فرمایا ہو: "اَسْلَمَ شَیْطَانِیْ" (میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے)۔

شیطان جس طرح آفاق میں ہے اسی طرح انفس میں بھی ہے۔
اور وہ جزوِ ناری ہے جو اپنے بہتر ہونے کا مدعی۔۔۔

تشریح

بلکہ یہ شیطانیت کی بنیاد ہے۔ شیطان خود اسی وجہ سے شیطان ہوا ہے۔ یہ جزوِ ناری جو ہے۔ اسی وجہ سے وہ شیطان ہوا ہے۔

متن

اور وہ جزوِ ناری ہے جو اپنے بہتر ہونے کا مدعی اور تکبر و رفعت کا خواہاں ہے جو رذیلہ عادتوں میں سے بدترین عادت ہے اور اس کے اسلام لانے سے مراد اُن بری عادتوں کا دور ہو جانا ہے۔ پس کمالاتِ نبوت میں قلب کا اطمینان بھی ہے اور نفس کا اطمینان بھی اور قالب کے اجزاء کا اعتدال بھی۔ اور (مرتبۂ) ولایت میں صرف یہی اطمینانِ قلب ہے اور کچھ کچھ نفس کا اطمینان بھی۔ اور یہ جو میں نے کہا کہ کچھ کچھ نفس کا اطمینان بھی، یہ اس لیے کہا ہے کہ نفس کو کامل اور بے تکلف اطمینان اجزائے قالب کے اعتدال کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

تشریح

وہ جبلت والی بات۔۔۔

متن

لہٰذا اربابِ ولایت نے اجزائے قالب کے عدم اعتدال کی وجہ سے نفسِ مطمئنہ کا صفاتِ بشریت کی طرف رجوع کرنا جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اور وہ اطمینان جو قالب کے اعتدال کے بعد نفس کو حاصل ہوتا ہے وہ خصائلِ رذیلہ کی طرف رجوع کرنے سے پاک و مبرا ہے، لہٰذا نفس کے رذائل کی طرف رجوع کرنے یا نہ کرنے کا اختلاف خیالات اور مقامات کے اختلاف پر مبنی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مقام کی نسبت خبر دی ہے اور اپنے علم کے مطابق بات کی ہے۔

تشریح

اُمت میں انفرادی اور اجتماعی اعتدال

(یہاں سے آگے اگلے متن تک اعتدال پر اہم باتیں ہیں) چونکہ اربابِ ولایت نفس مطمئنہ تک جاتے ہیں اس لئے ان کے اجزائے قالب میں اعتدال مفقود ہوتا ہے جس کی وجہ سے صفات بشریت کی طرف جو جبلت کی بے اعتدالی کی وجہ سے عین ممکن ہے رجوع کے وہ قائل ہیں لیکن اگر قالب کے اجزاء میں بھی اعتدال ہو تو وہاں خصائل رذیلہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی تبھی تو انبیاء معصوم عن الخطا ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم محفوظ ہیں۔ عام نیکوکار خطا کے پتلے ہیں لیکن جن پر فضل ہو جائے وہ خطا پر قائم نہیں رہتے۔ کُلُّکُمْ خَطَّاؤُون۔۔۔ الخ۔ خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہے جو کہ توبہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں یہی چیز موجود ہے۔ تو جن کی اصلاح ہو چکی ہوتی ہے ان کو تنبیہ جلدی ہو جاتی ہے اور وہ جلدی راستے پر آ جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء بالکل صراطِ مستقیم پر، ایک لائن، اس کے درمیان کوئی آگے پیچھے ہونا نہیں، کیونکہ ہر وقت مَامُور مِن اللہ ہوتے تھے۔ صحابہ کرام تھوڑے سے انحراف کے ساتھ چل لیتے تھے۔ ان کا standard deviation بہت تھوڑا تھا۔ اور ہم جیسے لوگوں کے لیے تو پکی سڑک ہے جی، کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔ یہ بھی نعمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ detrack جو نہیں ہوتا، جیسے ہی ہٹ جاتا ہے، اس کو پتا چل جاتا ہے کہ اوہو یہ تو میں دوسری طرف چلا گیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ افراط و تفریط تو ہمارے اجتماعی شعائر میں سے ہے۔ کیسے؟ دیکھیں یہ میں نے الحمدللہ باقاعدہ اس کا مطالعہ کیا ہے کہ اس امت میں یہ افراط و تفریط والا معاملہ چلتا رہتا ہے لیکن اس کا ٹھیک ہونے کا بھی انتظام ہے۔ مثلاً ایک وقت میں لوگ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے بہت زیادہ معتقد تھے۔ تو عام صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں کمزوری آ گئی۔ تو ہمارے بڑے حضرات نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقام کو بہت تفصیل سے بتایا۔ جب تفصیل کے ساتھ بتایا تو زور اس طرف چلا گیا، تو اہلِ بیت کی شان بیان کرنے میں کچھ کمزوری آ گئی۔ پھر اس کے بعد کچھ حضرات نے اس پراجیکٹ کو لے لیا اور انہوں نے اہلِ بیت رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو قصور ہوتا رہا ہے، ان کو بہت سختی کے ساتھ سمجھایا، تاکہ واپس آ جائیں۔ اسی طریقے سے ہم لوگ دوسری چیزوں میں بھی دیکھتے ہیں، افراط تفریط چلتا رہتا

ہے، طریقت میں بھی چلتا رہتا ہے۔ نقشبندیہ میں آجکل کیا ہو رہا ہے؟ یعنی صرف مراقبات پر زور ہے اور سلوک کی بات بھی کوئی نہیں کر رہا۔ تو اب یہ حکم صادر ہوا کہ دوسری طرف زور دیا جائے تاکہ یہ چیز ختم ہو جائے اور اس کو ٹھیک کر دیا جائے۔ اب ظاہر ہے اس طرف زور ڈالا جائے گا۔ لیکن اس طریقہ کو ہم ہمیشہ کے لئے بھی نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ اگر ہم سے غلطی ہو جائے تو پھر دوبارہ کوئی ٹھیک کرے گا۔ مطلب یہ کہ اس طرح افراط و تفریط جو ہوتا رہتا ہے اجتماعی طور پر، اس کو بھی اللہ پاک نے ٹھیک کرنے کا ایک نظام بنایا ہوا ہے۔ تو حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کی deviation کو ٹھیک کیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میں نے اس کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہوا ہے الحمدللہ۔ حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کی deviation کو ٹھیک کیا تھا، تو اس پر تو ان کو بڑا اجر مل گیا، لیکن آگے جا کر لوگوں نے اس چیز کو اتنا بڑھایا کہ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس کو ٹھیک کرنا پڑا۔ اور بڑے سخت الفاظ میں، لیکن ان کے مقام کے انکار کے ساتھ نہیں۔ ابھی بھی تھوڑی دیر پہلے گزرا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ ان کے مقام کے انکار کے ساتھ نہیں، بلکہ ایک جگہ پر صراحتاً فرما دیا کہ "وہ اہلِ محبت ہیں، اگر محبت میں ان سے کوئی خطاء ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اس کا حساب نہیں کریں گے۔" میں عرض کرتا ہوں کہ اس طرح ہوتا ہے۔ تو جو اس چیز کو جانتے ہے وہ معتدل رویہ رکھتے ہیں اور جو اس چیز کو نہیں جانتے وہ متشدد رویہ رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کی محبت میں مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہو جائیں گے۔ کچھ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی محبت میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہو جائیں گے۔ اور دونوں باتیں غلط ہیں۔ تو اسی طریقے سے ہمارے تبلیغی جماعت والے حضرات کو چونکہ حکمتاً صرف تبلیغ کے فضائل سکھائے جاتے ہیں، لہٰذا ان کو صرف یہ چیزیں مستحضر ہیں۔ اور دوسرے امور کے فضائل ان کی نظروں سے محو ہو چکے ہیں۔ نتیجتاً بعض دفعہ وہ دوسرے امور کے بزرگوں کی شان میں گستاخی تک کر جاتے ہیں۔ اس طرح امت میں توڑ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ دین کے دوسرے شعبوں کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ مدارس والوں میں کچھ لوگ ہوں جو کہتے ہوں کہ اصل کام تو یہی ہے، ہم ہی اصل کام کر رہے ہیں، باقی لوگ کیا کر رہے ہیں، باقی لوگ تو جھک مار رہے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہو گی۔

مجھے یاد ہے، جب میں اکوڑہ خٹک دارالعلوم حقانیہ سے حضرت مفتی رشید احمد

صاحب رحمہ اللہ کا اصل فتویٰ نکال رہا تھا، تو مجھ سے لائبریری کے جو نگران عالم تھے، مجھے کہتے ہیں کہ آپ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا، میں اس میں نمازوں کے اوقات کا طریقہ سیکھنا چاہتا ہوں۔ کہا! کون سے لغو کام پر لگ گئے ہو؟ عجیب! میں حیران ہو گیا۔ میں نے کہا، اس نے یہ بات کہی کیسے! خیر، چلو، بہر حال ان کی اپنی سوچ۔ میں نے تو اپنا مطلب نکالنا تھا۔ میں نے ان سے کتاب لے لی۔ پھر ایسا وقت آیا کہ اکوڑہ خٹک والوں نے خود مجھے کہا کہ آپ ہمیں نقشہ بنا دیں۔ بلکہ مفتی سیف اللہ صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ آپ کا نقشہ لگا ہوا ہے، میں اس کو دیکھ کر نماز پڑھتا ہوں۔ ٹھیک ہے، ایک وقت وہ تھا، ایک وقت یہ تھا۔

میں مفتی سیف اللہ صاحب کے پاس اپنے ایک دوست کے ساتھ گیا جو مولانا عبدالکریم حقانی صاحب کے برادرِ نسبتی تھے۔ نوجوان تھے۔ مفتی سیف اللہ صاحب سے ہم نے کہا، جی ہم نے میراث پر کام کیا ہے ذرا اس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے پوچھا کیا کام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ہم نے کمپیوٹر سافٹ ویئر بنایا ہے جس کے ذریعے سے میراث کے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ فرمایا، مجھے کسی کمپیوٹر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے کہا کہ الحمدللہ اس میں ہم نے آسان طریقے بنائے ہیں کہ اس سے آسانی کے ساتھ سیکھا جا سکتا ہے۔ دو دن میں سیکھا جا سکتا ہے۔ فرمایا ہمیں پرانا طریقہ زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اس طرح باتیں ہوئیں۔ وہ جو میرے ساتھی تھے، غصے سے بھر رہے تھے، قریب تھا کہ پھٹ جائیں۔ میں اس کے گھٹنے دبا رہا ہوں کہ بھئی کچھ کہنا نہیں۔ نوجوان تھے تو میں اس کو کنٹرول کر رہا ہوں۔ پھر اخیر میں جب مجھے پتا چلا کہ بالکل نہیں لینا چاہتے تو میں نے کہا، حضرت! دعا کے لیے آئے ہیں، آپ ہمارے لیے دعا کریں۔ تو حضرت نے ہاتھ اٹھائے اور ہمارے لیے دعا کی۔ جب باہر آئے تو اس نے مجھے کہا کہ آپ نے مجھے بات کیوں نہیں کرنے دی؟ میں نے کہا، بھائی! پھر بد دعا لیتے، اب دعا لے لی! کیوں ظاہر ہے ہمارا کام ہے وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ۔ ظاہر ہے بات پہنچانا ہے، اس کے بعد کوئی لیتا ہے تو بھی ٹھیک ہے، نہیں لیتا تو بھی ٹھیک ہے۔ باقی تو ظاہر ہے ہمارا کام تو للہ فی اللہ ہے۔ تو خیر اس کو سمجھ نہیں آئی۔ نوجوان تھے، نوجوانی کے جوش میں تھے۔ جا کر مولانا عبدالکریم حقانی صاحب کو سارا قصہ بتایا۔ تو خیر حضرت بھی بہت سخت ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ کم از کم مہمان کا حق ہوتا ہے، ایسا تو نہیں کرنا چاہیے۔ چلو ٹھیک

ہے اگر آپ کو اختلاف ہے، یا نہیں کرنا چاہتے تو اس وقت خاموش ہو جائیں لیکن یہ بات تو بالکل ٹھیک نہیں کہ آپ اس طرح بات کر لیں۔ خیر میں نے کہا کہ مجھے کچھ نقصان نہیں ہوا، کچھ مسئلہ نہیں ہوا۔ بعد میں مفتی سیف اللہ صاحب کے ساتھ کچھ لوگ میرے جاننے والے تھے، مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ میرے جاننے والے ہیں، لیکن وہ موجود تھے، انہوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ ہم نے حضرت کو کہا کہ حضرت! آپ نے کس سے بات کی ہے؟ وہ تو شبیر کاکا خیل تھے، وہ تو ایسے ہیں، وہ تو ایسے ہیں۔ کہتے ہیں، حضرت کو بڑی پریشانی لاحق ہو گئی کہ یہ میں نے کیا کر دیا؟ بہت افسوس کا اظہار کیا۔ اس کے بعد جب دوسری ملاقات ہوئی تو وہی پہلے والی باتیں یاد تھیں، تو مجھے کہا، دیکھو یہ آپ کا نقشہ لگا ہوا ہے، مطلب اس کو دیکھ کر نماز پڑھتا ہوں۔ ماشاء اللہ کافی دل خوش کرنے والی باتیں کیں۔ ٹھیک ہے جی، بزرگوں کی بات ہے۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ میں ان کے ساتھ کیوں لڑتا؟ وہ تو کسی وجہ سے اس کا ذہن بنا ہوا تھا۔ تو وہ ذہن ممکن ہے بالکل اخلاص پر بنا ہو۔ مجھے کیا مفر ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہے میرا طریقہ اور ہے، میں نے جس چیز پر محنت کی ہے وہ الگ ہے، میرے اوپر اللہ پاک نے کچھ باتیں کھول دیں تو اللہ کا شکر ہے، فضل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باتیں دوسروں پر بھی کھولی گئی ہوں۔ عین ممکن ہے کہ ان کو اس چیز کا پتا نہ ہو۔

تو بہر حال میں عرض کرتا ہوں کہ اسی طریقے سے سوالات و مسائل ہوتے ہیں۔

متن

سوال: جب قالب کے اجزاء بھی حدِ اعتدال پر آ جائیں اور طغیان و سرکشی سے باز رہیں تو پھر ان کے ساتھ جہاد کی کیا صورت ہے؟ اور کیا نفسِ مطمئنہ کی طرح ان کے ساتھ بھی جہاد اُٹھ جاتا ہے؟

جواب: (نفسِ) مطمئنہ اور ان اجزاء کے درمیان فرق ہے کیونکہ مطمئنہ استہلاک و اضمحلال والا (فانی اور ناچیز) ہے اور وہ عالمِ امر سے ملحق ہے جو کہ کمالِ فنا اور سُکر سے متصف ہے۔ اور یہ اجزاء احکامِ شرعیہ کے بجا لانے کے باعث جس کی بنیاد صحو پر ہے استہلاک و سکر سے مناسبت

نہیں رکھتے۔ اور مستہلک میں اس کی مخالفت کی گنجائش نہیں ہے، اور جو صحو کی حالت میں ہو اگر وہ بعض مصالح و منافع کی بنا پر بعض امور میں مخالفت کی صورت ظاہر کرے تو گنجائش ہے۔اور امید ہے کہ یہ مخالفت خداوند جل سلطانہٗ کے فضل سے استحباب کے ترک سے زیادہ نہیں ہو گی، اور کراہتِ تنزیہ کے ارتکاب سے زیادہ نیچے نہیں جائے گی، لہٰذا قالب کے مرتبہ میں اس کے اجزاء کے اعتدال کے باوجود جہاد متصور ہو گا اور مطمئنہ کے درجے میں جہاد جائز نہیں ہو گا۔ اس بحث کی تحقیق دفتر اول کے اس مکتوب 260 میں جو طریق کے بیان میں فرزندی اعظمی (خواجہ محمد صادق) مرحوم کے نام تحریر کیا گیا تھا تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ اگر کوئی امر پوشیدہ رہ گیا ہو تو اس کی طرف رجوع کریں۔

اگر محض فضلِ خداوندی جل سلطانہ سے کمالاتِ نبوت بھی جو حقیقتِ شریعت کے نتائج و ثمرات ہیں انجام کو پہنچ جائیں اور وہاں کی ترقیات اعمال کے ساتھ وابستہ نہ ہوں تو اس مقام میں معاملہ محض حضرتِ رحمٰن جل سلطانہٗ کے فضل و احسان پر موقوف ہے، اعتقاد کا وہاں کوئی اثر نہیں، اور وہاں علم و عمل کا بھی کوئی حکم جاری نہیں ہوتا بلکہ فضل در فضل اور کرم در کرم ہے۔ یہ مقام سابق مقامات کی نسبت بہت عالی ہے اور بڑی وسعت رکھتا ہے اور اس قسم کی نورانیت رکھتا ہے کہ جس کا سابق مقامات میں کوئی اثر نہ تھا۔ اور یہ مقام اصالتاً انبیاءِ اولوالعزم علیہم الصلوات والتسلیمات کے ساتھ مخصوص ہے اور اُن کی پیروی کی وجہ سے جس کو چاہیں نواز دیں۔ اور وراثت کے طور پر جس کو چاہیں مشرف کر دیں۔

باکریماں کارہا دشوار نیست

تشریح

یعنی فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اگر کمالاتِ نبوت بھی جو حقیقتِ شریعت کے نتائج و ثمرات ہیں انجام کو پہنچ جائیں اور وہاں کی ترقیات اعمال کے ساتھ وابستہ نہ ہوں۔۔۔ یعنی وہ یوں سمجھ لیں کہ اعمال تو وہاں نہیں ہیں لیکن مقام وہاں پر ہے، اور وہ مقام اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملا ہے۔ تو اس کے حساب سے اللہ تعالیٰ ان

کو نوازتے ہیں۔

متن

اس مقام پر کوئی شخص غلطی نہ کرے اور یہ نہ کہے کہ اس مقام میں صورتِ شریعت اور حقیقتِ شریعت سے استغنا حاصل ہو جاتا ہے اور احکامِ شرعیہ کی بجا آوری کی ضرورت نہیں رہتی۔کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ شریعت ہی اس کام کی اصل اور اس معاملہ کی بنیاد ہے۔ درخت خواہ کتنا ہی بلند و سر فراز ہو جائے اور دیوار خواہ کتنی ہی بلند ہو جائے اور اس کے اوپر بڑے بڑے محلات تیار کر لیے جائیں لیکن وہ اصل اور بنیاد سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور ذاتی احتیاج ان سے زائل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً بلند مکان خواہ کتنا ہی بلند کر لیا جائے اور پستی سے کتنا ہی اونچا ہو جائے، پھر بھی نیچے والے مکان کے بغیر اس کو چارہ نہیں ہے۔۔۔

تشریح

یعنی کہیں سے شروع تو ہو گا نا۔

متن

اور زمین والے مکان سے اس کی احتیاج ہر گز زائل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر فرض کیجیے کہ مکان کے نیچے والے حصہ میں کسی قسم کا خلل پیدا ہو جائے تو اس کا اثر اوپر والی منزل پر بھی ہو گا اور نیچے کا زوال اوپر کی منزل کے زوال کا باعث ہو گا۔ لہٰذا شریعت ہر وقت اور ہر حال میں درکار ہے اور ہر شخص اس کے احکام کی بجاآوری کا محتاج ہے۔

تشریح

یہ بہت اہم نکتہ ہے کہ شریعت سے کسی حال میں مُفر نہیں کیونکہ شریعت بنیاد ہے اور بنیاد نیچے ہوتی ہے لیکن اوپر کی ساری منازل اس کی وجہ سے قائم ہوتی ہیں۔نہایت عمدہ مثال ہے۔

متن

اور جب عنایتِ خداوندی جل شانہُ سے معاملہ اس مقام سے بھی بالا ہو جائے اور کام فضل سے بڑھ کر محبت میں آ جائے تو پھر ایک ایسا مقام آتا ہے جو بہت زیادہ بلند اور اصالۃً حضرت خاتم الرسل علیہ وعلیہم وعلیٰ آل کل الصلوات والتسلیمات والتحیات والبرکات کے لیے مخصوص ہے اور تبعیت و وراثت کے طور پر دیکھئے کس کو اس دولت سے مشرف فرماتے ہیں۔ اور وہ بلند و بالا محل جو نہایت بلندی کی وجہ سے نظر میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے (یہ فقیر) حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو اس مقام میں وراثت کے طور پر ناف تک داخل ہوا پاتا ہے اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ بھی اس دولت سے سرفراز ہیں۔ اور امہات المومنین میں سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ ازدواجی تعلق کی وجہ سے اس مقام میں دیکھتا ہے۔ "وَالْاَمْرُ اِلَی اللّٰہ سُبحَانَہ"۔ "رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا"۔

تشریح

فضل کا معاملہ عمل سے اونچا ہے لیکن فضل سے اونچا مقام ان کا ہے جو مقام محبوبیت میں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں ان کے مقام کا ادراک کس طرح ہو سکتا ہے بس یہی کہا جا سکتا ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

بلکہ وہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان کے مقام تبعیت اور آپ کی محبوبیت کی برکت سے کتنا اعلیٰ ہے اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

متن

اخوی اعزی معارف آگاہی شیخ عبدالحی کہ جس نے سالہا سال صحبت میں گزارے ہیں اور اب اپنے وطن کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اس

مقام کا تعلق بھی ان ہی کی جناب سے ہے اس لیے ضرورتاً یہ چند سطریں تحریر کی گئیں اور مشارٌ الیہ کے احوال کی اطلاع دے دی گئی۔ اہل اللہ کا وجود جہاں بھی ہو غنیمت ہے اور اس مقام کے باشندوں کے لیے خوشخبری ہے۔ فطوبیٰ لمن عرفہم۔ (مبارک ہیں وہ لوگ جو ان کو پہچان لیں)۔ اور اسی مقام میں اخوی اعزی شیخ نور محمد بھی قیام پذیر ہیں اور فقر و نامرادی میں گزربسر کر رہے ہیں، لہٰذا اس مقام پر رشک آتا ہے جہاں اس قسم کے دو اہل اللہ جمع ہوں۔ قران السعدین (دو نیک ستاروں کا اجتماع) متحقق و ثابت ہے۔ والسلام

تشریح

یہ تو گویا حضرت نے ان حضرات کی اطلاع کر دی جن کو حضرت اچھا سمجھ رہے تھے۔ لیکن اس میں جو اہم بات آئی وہ یہ ہے کہ اصل تو شریعت ہے لیکن شریعت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے۔ جو ظاہر ہوتا ہے وہ شریعت کی صورت ہوتی ہے یعنی اُس طرح کرنا ہے اور جو حقیقت ہوتی ہے۔ تو اُس تک ہر ایک نہیں پہنچ سکتا لیکن ظاہر پر عمل تو کرنا ہے۔ تو جو حضرات شریعت کی حقیقت کے عارف ہو جاتے ہیں تو اُن کو صحیح معنوں میں شریعت پر عمل نصیب ہو جاتا ہے۔ صورت کا تعلق تو اوامر و نواہی سے ہے۔ اور یہ ولایت کے کمالات ہیں۔ اور جو حقیقت ہے وہ نبوت ہے۔ مطلب یہ کہ نبوت حقیقت ہے اور ولایت اُس کی صورت ہے۔ البتہ جو حضرات نبوت کی تبعیت سے ان مقامات تک پہنچ جائیں تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفہ ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتے ہیں۔ بہر حال جو ولایت ہے اس میں نفس کو فنا کرنا پڑتا ہے کہ نفس کو فنائیت حاصل ہو جائے۔ اور جب نفس کی فنائیت حاصل ہو جائے تو سلوک الی اللہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد صرف بقاباللہ رہ جاتا ہے جو کہ طریقِ صحابہ ہے۔ اس میں انسان جتنا بھی آگے چلا جائے وہ اُس کا نصیب ہے۔ تو کمالاتِ نبوت جس کو ہم کہتے ہیں وہ حقیقت ہے اور جو کمالاتِ ولایت ہے وہ اس کی صورت ہے۔ اس کے بعد جو فضل والی بات ہے اُس کی بات اور ہے کیونکہ وہ اعمال کے ذریعے سے ترقی نہیں بلکہ وہ فضل کے ذریعے سے ہے اور یہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جن کو چُنا جاتا ہے۔ یہ محبوبوں والی بات ہے۔

مقاماتِ قُطبیہ و مقالاتِ قُدسیہ

تصنیف

حضرت حلیم گل بابا رحمۃ اللہ علیہ فرزند حضرت کاکاصاحب رحمۃ اللہ علیہ

ازاِ فادات

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل مدظلہ

الحمدللہ، اللہ جل شانہ کا بہت شکر ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہمیں اہل ایمان میں فرما دیا پھر اللہ جل شانہ نے الحمدللہ ان اکابر تک ہماری رسائی فرمائی جن پر اللہ تعالیٰ نے بہت کرم فرمایا تھا۔ جن میں حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی شریف جن کا درس ہفتہ کے روز سالہا سال سے ہوتا رہاہے۔ اس کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات شریف کی جلد انفاسِ عیسٰی ہے جس میں حضرت کے قلب مبارک کے فیوض و برکات بکھرے ہوئے ہیں، اسکی تعلیم ہفتہ وار چل رہی تھی اور بارہ سال میں تکمیل تک پہنچ گئی۔ الحمدللہ اسکا پاور پوائنٹ بن گیا ہے اور اب مختلف جگہوں پر لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس کے بعد اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریف کی تشریح کی توفیق نصیب فرمائی اور حضرت کا خاص مکتوب، جو حضرت نے اپنے بھائی غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھا تھا، جس میں حضرت نے سلوک اور جذب کے بارے میں بڑی تفصیلی بات فرمائی تھی۔ اس کی تشریح بھی اللہ پاک نے کروائی اور الحمدللہ وہ چھپ بھی گئی ہے اور اسکا نام رکھا گیا ہے "حقیقتِ جذب و سلوک"۔

بدھ کے دن مکتوبات شریف کی تعلیم کافی عرصے سے چل رہی ہے اور ان شاءاللہ چلتی رہے گی۔ یہ تو معرفت کا سمندر ہے اس میں ہم جیسے لوگ مسلسل غوطہ زن ہوں تو برکات اور فیوضات ان شاءاللہ ملتے رہیں گے۔

اس کے بعد قلب پر یہ ارادہ وارد ہوا کہ ہمارے جدِ امجد حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اولیاءاللہ میں ایک خاص شان رکھتے تھے۔ سہر وردی اور چشتی سلسلے کے خصوصی امین تھے اُن کی تعلیمات کو فروغ دیاجائے۔ یہ بہت عجیب نسبی سلسلہ ہے کہ سارے اکابر جو حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک نسبی طور پر چلے آتے ہیں یہ سارے اولیاءاللہ تھے۔ یعنی ان کے والد، ان کے دادا اور ان کے بڑے اور ان سے بڑے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ تک مسلسل اولیاء ہیں اور ہر ایک کا اپنا اپنا مقام اپنے اپنے علاقوں میں واضح ہے۔

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے آخری دور میں گزرے ہیں اور حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص الخاص مرید حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ جن کا سلسلہ بنوریہ نقشبندیہ مشہور ہے وہ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نقشبندی سلسلہ کی دوشاخیں چلتی ہیں ایک معصومیہ جو حضرت کے اپنے صاحبزادے سے چلی ہے اور ایک بنوریہ جو کہ انہی بزرگ حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے چلی آرہی ہے۔

تو حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔ چونکہ حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم تھے اور حضرت کاکا صاحب خود بھی بہت بڑے عالم تھے اور علماء کے بہت بڑے قدردان تھے تو جب نماز کا وقت آیا تو کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کو فرمایا کہ آپ نماز پڑھائیں۔ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی لجاجت سے کہا کہ باقی باتیں تو میں آپ کی مان سکتا ہوں لیکن یہ بات ماننے کی نہیں ہے کیونکہ میں تو اسی کے لئے آیا ہوں کہ آپ کے پیچھے نماز پڑھوں۔ مجبوراً حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نماز پڑھائی اور اس کے بعد حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تاریخی فقرہ کہا کہ آج جو نماز آپ کے پیچھے پڑھی ہے ایک یہ نماز ہے اور دوسری وہ نمازیں جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پڑھی ہیں۔باقی نمازیں اس طرح کی نہیں ہیں۔ پھر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے کو حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حج کے سفر میں رفیق سفر کر دیا۔

یہ اولیاءاللہ کا بہت عجیب سلسلہ ہے۔ اس وجہ سے دل پر یہ وارد ہوا کہ ایک قسم کی بے وفائی والی صورت بن جاتی ہے کہ ہم باقی اکابر کی باتیں کریں، اُن کی تعلیمات اور ملفوظات بیان کریں اور اپنے گھر کی بات سے ہم لوگ ناواقف رہیں۔ مجھے اپنی زندگی

کا تجربہ بھی اس کے ساتھ ہوا ہے اور وہ تجربہ بھی یاد ہے اس وجہ سے بھی ذہن اس طرف چلا گیا۔ جس وقت میں حضرت مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوا جو کہ سلیمانی نسبت کے بہت بڑے ولی اللہ تھے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو مجھے ایصال ثواب کے لئے فرمایا کہ اپنے اکابر کے لئے ایک دفعہ سورت فاتحہ اور تین دفعہ سورت اخلاص سے ایصال ثواب کر لیا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سارے انبیاء کے لئے، صحابہ کے لئے اور چاروں سلسلوں کے مشائخ کے لئے۔ چونکہ حضرت کا حکم تھا اس لئے شروع کر لیا۔ ان دنوں میں نے خواب دیکھا۔خواب میں ہمارے خاندانی اکابر میں ایک بزرگ تھے جن کا نام تو معلوم نہیں لیکن خاندان کے بڑے بزرگوں میں سے تھے تو انہوں نے مجھے فرمایا کہ آپ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ اب تو ہم آپ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ میں بڑا حیران ہو گیا کہ یااللہ یہ کیا ہوا؟ پھر میں جاگ گیا تو سمجھا کہ یہ تو منہ پر تھپڑ ہے۔ لیکن یہ تھپڑ کیوں مارا گیا؟ اس کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ تو یہ بات دل میں آئی کہ میں ایصال ثواب باقی اکابر کے لئے تو کرتا ہوں لیکن اپنے آباؤ اجداد اکابر کو نہیں کرتا۔ شاید یہ وجہ ہے۔ ہمارے کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ایک بزرگ گزرے ہیں سید تنظیم الحق حلیمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور جس بزرگ نے یہ کتاب مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ لکھی ہے۔ انہی کی اولاد میں سے ہیں اور وہ ہمارے پھوپھا جان بھی تھے۔ تو اُن سے میں نے عرض کی کہ حضرت اس طرح میں نے خواب دیکھا ہے اور میرا تو خیال ہے کہ یہ منہ پر تھپڑ ہے۔ حضرت نے فرمایا بات تو یہی ہے۔ پھر میں نے کہا یہ کیوں ہے میرے دل میں بات آرہی تھی کہ میں باقی اکابر کے لئے ایصال ثواب کر رہا ہوں لیکن اپنے خاندان کے اکابر کے لئے نہیں کر رہا شاید یہ وجہ تو نہیں؟ فرمایا بالکل یہی وجہ ہے۔

اس کے بعد آپ لوگوں نے سنا ہو گا کہ میں جب ایصال ثواب کرتا ہوں تو کہتا ہوں اپنے آباؤ اجداد کے لئے۔ اس طرح کی بات بھی چونکہ پہلے گزری ہے تو میں نے کہا کہ کہیں دوبارہ اسطرح کی بات نہ ہو جائے۔ تو میرے دل میں یہ خیال آیا اور بڑی مضبوطی کے ساتھ آیا اور اس کے ساتھ تکوینی اسباب بھی بن گئے کہ منگل کا دن بھی فارغ ہو گیا۔ اس وجہ سے آج کے دن ہم نے اس کتاب کی تعلیم شروع کی۔ یہ حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے۔ زیارت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ان کا بھی مزار ہے اور ان کے مزار میں ایک خاص بات ہے کہ جن لوگوں

پر جنات ہوتے ہیں جب ان کو وہاں لے جاتے ہیں تو جنات ان سے اُتر کر وہیں رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ وہ شاید یہ سمجھے کہ یہ شرک ہے۔ بات تو بظاہر یہی لگتی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ مولانا عبدالحلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کو حلیم گل بابا رحمۃ اللہ علیہ بھی کہتے ہیں وہاں جنات کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جن کو حضرت سے محبت ہے اور جنات میں بھی اتنے مذاہب اور مسالک ہیں جتنے انسانوں میں ہیں اور ان کے نام بھی وہی ہیں یعنی ہندو، عیسائی، یہودی ، مسلمان اور مسلمانوں میں بھی سارے مسالک ہیں۔ جیسا کہ انسانوں میں بھی بہت سارے انسان حلیم گل بابا رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کرتے ہیں تو اس طرح جنات میں بھی ہیں جو ان سے محبت کرتے ہیں۔ تو وہ لوگ جن پر جنات ہوں وہ جب حضرت کے مزار پر جاتے ہیں تو مزار کے جو جنات ہوتے ہیں جو کہ طاقت میں بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں وہ ان جنات کو پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ میں نے جب اپنے ساتھی کو یہ بات بتائی تو وہ سمجھ گئے۔ چونکہ لوگوں کو سطحی باتیں معلوم ہوتی ہیں اس وجہ سے بہت بڑے بڑے حکم لگا دیتے ہیں۔

حضرت حلیم گل بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خود والد صاحب کا طریقہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کونسا طریقہ ہے تو ایک دفعہ کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود پوچھا کہ بابا بزرگوں کے مقامات ہوتے ہیں آپ کا کونسا مقام ہے؟ کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا عجیب جواب دیا۔ فرمایا "بیٹا میں نے علم علماء کے لئے چھوڑ دیا ہے، درویشی درویشوں کے لئے اور فقیری فقیروں کے لئے چھوڑ دی ہے۔ میرے گلے میں اللہ پاک نے بندگی کا ایک طوق ڈالا ہوا ہے میں چاہتا ہوں کہ موت تک یہ میرے گلے میں رہے۔ بس یہ میرا مقام ہے"۔ اس کو مقامِ عبدیت کہتے ہیں جو کہ بہت اونچا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سادہ اور عوامی الفاظ میں بیان فرمایا لیکن واقعتاً اس کو سمجھانا کافی مشکل ہوتا ہے۔ یہی ایک کامل شخص کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ بہت اونچی باتیں سادہ اور عوامی الفاظ میں بیان کر لیتے ہیں اور لوگوں کو اس کی قدر نہیں ہوتی کیونکہ وہ سادہ الفاظ میں بیان ہوتی ہے۔ لوگ ایسی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں جو بہت پُراِسرار قسم کی ہوتی ہیں اور یہ ہوتا بھی ہے وہ لوگ جو اہلِ باطل ہوتے ہیں اسی سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اہل باطل کو اگر آپ دیکھیں تو بڑی موٹی موٹی باتیں کریں گے لیکن عمل سے خالی ہونگے اور اہلِ حق جو لوگ ہوں گے وہ بہت سادہ سادہ بات کریں گے لیکن عمل سے بھرپور ہوں

گے۔ یہی ان کی پہچان ہے۔

اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو دیکھیں تو وہ کہاں گہری گہری باتیں کرتے تھے۔ بس سادہ سادہ باتیں ہوتی تھیں اور اسی میں بہت گہرائی ہوتی تھی۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس جارہے تھے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ آپ وہاں جارہے ہیں وہ لوگ لباس سے بہت اثر لیتے ہیں مہربانی کر کے آپ ایسا لباس زیب تن کر لیں جس میں کم از کم ان کو اس سے دوری نہ ہو اور آپ کا مقام اُن کو کم نظر نہ آئے۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے پاس تو ایسا لباس نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ جمعہ کی نماز کے لئے تاخیر سے آئے۔ ان دنوں امیر المؤمنین نماز پڑھاتے تھے اور حضرت تو تھے ہی امیر المومنین تو سب لوگ انتظار کر رہے تھے۔ جب لوگوں نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میرے پاس ایک ہی لباس تھا اُس کو دھو لیا تھا اور اس کے سوکھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب دیکھیں یہ تھے امیر المومنین۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے پاس ایسا جوڑا نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کیا میں پیش کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ضرور اور زیب تن کر لیا۔ لیکن ابھی تھوڑے سے ہی آگے گئے تھے کہ رُک گئے اور کہا معاویہ تو نے مجھے ہلاک کر دیا تھا اس لباس نے تو مجھے مشغول کر دیا اور وہ جوڑا واپس کیا اور اپنا جوڑا پہن لیا اور فرمایا میرے لئے یہی چیز ٹھیک ہے۔ اب یہ بہت گہری بات ہے لیکن حضرت نے بہت سادگی سے بیان فرمایا کہ یہ بہتر ہے۔ اس پر بہت بڑی بڑی تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ مشغولیٔ حق ہے یا مشغولیٔ غیر حق اور یہاں تک فرمایا کہ مساجد کے اندر دیواریں منقش نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس میں مشغولیت ہو جاتی ہے۔ ایک انسان نماز پڑھ رہا ہے اور اسکی طرف ذہن چلا جائے۔ اس طرح مساجد کے جو قالین ہیں وہ بھی منقش نہیں ہونے چاہئیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس دور کے مجدد ہیں انہوں نے اس فقہی مسئلے سے روحانی مسئلہ نکال لیا اور فرمایا کہ میں تو کہتا ہوں کہ دل بھی منقش نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اگر دل منقش ہو تو اپنے دل میں مشغولیت ہو جائے گی اور وہ بھی غیر حق ہے۔ کیسی بڑی بات فرمائی۔ جو کشفوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے کہ مجھے فلاں کشف ہو گیا، فلاں کشف ہو گیا وہ اسی مشغولیت کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور اللہ سے کٹ جاتا ہے۔

تو حضرت نے جو فرمایا کہ دل بھی منقش نہیں ہونا چاہئے روحانی طور پر کتنی اونچی بات ہے۔ بس آپ تشریح کرتے جائیں لیکن کہنے والوں نے کہہ دیا سمجھانے والوں نے سمجھا دیا۔ یہی بزرگوں کے پاس ہوتا ہے۔ اُن کا عمر بھر کا نچوڑ ہوتا ہے اس وجہ سے ایسے حضرات کی کتابوں کو پڑھنے میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے بڑے تجربوں، مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد جو سیکھا ہوتا ہے تو وہ چند الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اگر ہمیں قدر ہو تو ہمیں حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے انجینئر، سائنسدان ہوں تو لوگ ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں کہ ان سے کوئی کام کی بات مل جائے تو وہ ہم سنبھال لیں۔ ڈاکٹر حضرات پروفیسر حضرات کے ساتھ لوگ لگے ہوتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی بات ہمیں مل جائے جو ہمارے لئے بہت بڑی بات ہو۔ تو اس سے بہت بڑا فائدہ ہو جاتا ہے۔ اصل یہی بات ہے کہ ان کی قدر وہی لوگ کرتے ہیں جو ان کے قدردان ہوتے ہیں۔ تو یہی بات ہے جس کی وجہ سے ہم بزرگوں کی باتیں کرتے ہیں۔ جو نچوڑ ہوتا ہے اُس کو ہم حاصل کر لیتے ہیں۔ میں اس کو دوسرے انداز میں عرض کروں۔ فرمایا بزرگوں نے کہ اگر کوئی اپنے شیخ کی مجلس میں بیٹھا ہو تو ذکرِ لسانی نہ کرے۔ اپنے دل کو شیخ کے دل سے ملا کے رکھے کہ شیخ کے دل پر جو فیض آرہا ہے ان کے دل سے وہ فیض مجھے مل رہا ہے اور فرمایا کہ یہ اصلی ذکر ہے کیونکہ براہ راست اللہ کی طرف سے آرہا ہے اور یہ ذکر اس کو اللہ سے ملا رہا ہے۔ اس میں الفاظ کا سہارا نہیں بلکہ براہِ راست اللہ سے ملا رہا ہے۔ اس وقت یہ سمجھانا مشکل کام ہوتا ہے لیکن جن کو سمجھ آجائے ان کے لئے بہت اونچی بات ہوتی ہے پھر وہ یہی کرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تو فارغ بیٹھے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے ان کو کچھ دے رہا ہوتا ہے۔ اس طرح ہمارے جو مشائخ ہیں جنہوں نے زندگی کا بڑا وقت اللہ تعالیٰ کے عرفان کو حاصل کرنے میں لگا دیا اور اللہ پاک نے ان کو وہ موتی دے دیئے جو کہ ایسے وقتوں میں دیئے جاتے ہیں اور وہ ان کے پاس ہوں اور کوئی قدردان ظاہر ہے کہ ان کی کتابوں کو دیکھ لے اور ان کی تعلیمات کو پڑھ لے اور ان کو وہ موتی حاصل ہو جائیں تو یہ مفت کی کمائی ہے۔

ہم لوگ نہ تو اتنے مجاہدے کر سکتے ہیں نہ تو ریاضتیں کر سکتے ہیں نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہے۔ صحیح بات عرض کرتا ہوں کہ نہ تو ہمارے پاس اتنی صلاحیت ہے نہ وقت ہے ایسی صورت میں اگر ہم ان بزرگوں کی تعلیمات سے بھی اعراض کر

لیں اور خود ہمارے اندر بھی صلاحیت نہ ہو تو پھر نتیجہ کیا ہو گا؟ کورے کے کورے رہ جائیں گے۔ علماء نے اپنے علوم کی قدر کی الحمدللہ اور بڑے بڑے علوم کے خزانے جو کتابوں میں موجود ہیں ان کو جو پڑھتے تھے اور ان علوم تک ان کو جو رسائی حاصل ہوتی ہے تو علوم کے خزانے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح مشائخ نے معارف کی قدر کی ہے۔ معرفتِ الٰہی جو ان کو قلبی اور وجدانی طور پر حاصل تھا انہوں نے اس کی قدر کی اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ نعمتیں نصیب فرمائیں۔ میں اگر اس کو ایک لفظ میں عرض کرنا چاہوں شاید اس مجلس کی برکت ہے الحمدللہ وہ یہ ہے کہ میں صبر کے اوپر ایک بہت اچھی کتاب پڑھ کر صبر کی تمام تفصیلات سے آگاہ ہو جاؤں تو صبر کا علم حاصل ہو گیا اور بہت قیمتی علم۔ لیکن کسی اللہ والے کے ساتھ بیٹھ کر مجھے صبر حاصل ہو گیا اور صبر کے الفاظ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تو ان دونوں میں کیا چیز بہتر ہے؟ اگر میں صبر کا علم تو حاصل نہیں کر سکا لیکن صبر حاصل ہو گیا تو کیا چیز حاصل ہو گئی؟ اللہ پاک کا فرمان ہے " اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ " بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس سے کیا ظاہر ہو رہا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ صبر کا علم رکھنے والے کے ساتھ ہے یا صبر کرنے والے کے ساتھ ہے؟ جس کو صبر حاصل ہے اس کے ساتھ تو براہ راست ہے۔ یہی وہ چیزیں ہوتی ہیں جو مشائخ کے ہاں ملا کرتی ہیں اور جس کی قدر کی جاتی ہے اور اس کے لئے تو علماء بھی بزرگوں کے ہاں تشریف لے کر جاتے ہیں۔ آخر حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کیوں تشریف لے گئے تھے؟ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کیوں تشریف لے گئے تھے؟ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کیوں تشریف لے گئے تھے؟ یہ بڑے علماء تھے۔ چھوٹے علماء نہیں تھے، بڑے علماء تھے۔ علمی مقام اُن کا بہت اونچا تھا۔ دور دور تک اُن جیسا کوئی نظر نہیں آتا تھا لیکن اسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے جو میں نے ابھی بیان کی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ یہی بات حضرت قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ تو خود عالم ہیں آپ حاجی صاحب کے پاس کیوں تشریف لے گئے تھے جو عالم بھی نہیں ہیں؟ فرمایا ہاں ہم عالم ہیں، ہم عالم ہیں ہمیں پتا ہے کہ کیلا بھی ہوتا ہے، ککڑی بھی ہوتی ہے، انار بھی ہوتا ہے، سنگترہ بھی ہوتا ہے یہ بھی ہوتا ہے وہ بھی ہوتا ہے لیکن کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔ حاجی صاحب کے پاس گئے ان کو ان چیزوں کے نام تو معلوم نہیں تھے لیکن ساری چیزیں ان کے

پاس تھیں۔ وہ کھلا رہے تھے، کبھی کیلا کھلا رہے ہیں تو ہمیں پتا چل رہا ہے کہ کیلا کھا رہے ہیں، کبھی ککڑی کھلا رہے ہیں تو ہمیں پتا چل رہا تھا کہ ککڑی کِھلا رہے ہیں لیکن ہمیں صرف معلوم تھا۔ ان کے پاس یہ ساری چیزیں تھیں۔یہی وہ ساری چیزیں ہیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے عرض کی تھیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم لوگ اگر قرآن کے حکم کے مطابق "وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِيْنَ" پر عمل کرتے ہوئے اللہ والوں کے ساتھ ساتھ رہیں تو وہ جو مقامِ صدق ان کو حاصل ہے وہ آہستہ آہستہ ہمیں بھی حاصل ہو جائے گا۔ ان کی برکت سے ہمیں بھی حاصل ہونے لگے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمادے۔ آمین

تو بہرحال یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے اکابر کی کتابوں کی قدر کرتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ شاید قدر کرنے کے لئے یہ لفظ کافی نہیں ہے ہم لوگ تو قدر نہیں کرتے۔اس کو ہم کہتے ہیں کہ قدر کرتے ہیں۔ اصل قدر تو ہم نہیں کرتے۔ اصل پتا ہو تو ہم قدر کریں لیکن بہرحال کوشش کرتے ہیں۔ اکابر کی نقل کرتے ہیں جیسے وہ اپنے اکابر کی قدر کرتے تھے ہم بھی ان کی نقل میں اللہ کی توفیق سے تھوڑی بہت قدر کرتے ہیں۔

معرفتِ الٰہی کا حصول

از

عبقات شاہ اسمعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

تشریح و ترتیب

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

نوٹ۔ یہ مضمون مشکل ہے۔ ممکن حد تک اس کو آسان کیا گیا ہے لیکن ایک حد تک ہی آسان ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ان کا جاننا ہر ایک کے لئے ضروری بھی نہیں صرف مبتلا اور مقتدا کے لئے ہے۔ البتہ کسی کو سمجھ آرہی ہوں تو پڑھنے میں حرج بھی نہیں۔

علمِ الٰہیات کا تعارف

یہ ان مباحث کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں ذاتِ باری تعالیٰ، اُس کی صفات اور کائنات، مبداءِ کائنات، مخلوق کا خالق سے ربط و تعلق اور ان سے متعلقہ مسائل سے گفتگو کی جاتی ہے۔ جدید دور میں اس کی ضرورت یوں پڑی کہ علوم تک رسائی آج کل انٹرنیٹ نے بہت آسان بنائی ہے لیکن ان علوم کو سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہوتی ہے وہ تو ہر ایک کے پاس نہیں ہوتے تو جن کے پاس وہ علوم نہ ہوں تو نیم مُلا خطرہ ایمان والی بات کا خدشہ ہوتا ہے۔ اگر ان پیچیدہ مباحث میں کوئی نہ پڑے اور سادہ سادہ دین پر عمل کرتا رہے تو بچت کی امید زیادہ ہے۔ لیکن اگر کسی نے اس میدان میں کسی طرح کچھ طبع آزمائی کرلی ہو تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ اِس کو پھر واقعی سمجھ لے۔ میں نے اپنے شیخ مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ پوچھا کہ کیا میں "تقویت الایمان" کا مطالعہ کرلوں؟ حضرت خاموش ہوئے۔ میں نے پھر پوچھا پھر خاموش ہوئے۔ جب تیسری دفعہ پوچھا تو فرمایا کہ ہاں پڑھو لیکن اچھی طرح پڑھو کہ اس کو سمجھ جاؤ، حضرت کی بات میں اسی طرف عملاً اشارہ ہے۔ یہ میدان بہت ہی نازک ہے، اسی لیے پوری تاریخ اسلام میں علماءِ اسلام میں سے چند شخصیات ہی اس موضوع کو زیر بحث لانے سے مشہور ہوئی ہیں۔ ان میں

شیخ اکبر امام ابن عربی ؒ، امام ابن تیمیہ ؒ، امام غزالی ؒ، مجدد الف ثانی ؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ اور قریبی دور میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید ؒ کے نام نمایاں ہیں۔ مؤخر الذکر نے اس موضوع پر ایک معرکۃ آراء کتاب "عبقات" لکھی ہے۔ جو خود مصنف کی تصریح کے مطابق امام ابن عربی ؒ اور مجدد الف ثانی ؒ کے علوم وافکار سے اثر لے کر، شاہ ولی اللہ صاحب ؒ کی "لمعات" اور "سطعات" کی شرح وتوضیح کے لیے لکھی گئی ہے۔ "عبقات" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسمعیل شہید ؒ اسلامی الٰہیات کے موضوع پر ان تین خط کشیدہ شخصیات سے خاص طور پر متاثر ہیں اور ان کے علوم وافکار کے دلدادہ اور خود ان تینوں بزرگوں کے نہایت معتقد ہیں۔ یاد رہے یہی وہ وصفِ جامع ہے، جسے آج بھی شاہ ولی اللہ ؒ کے طرز پر "علماءِ دیوبند" مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ یہ حضرات امام ابن عربی ؒ اور ان کے فلسفہ وحدت الوجود میں نہ حد درجہ غلو رکھتے ہیں نہ انکار، اسی طرح امام ربانی مجدد الف ثانی ؒ کے فلسفہ وحدت الشہود میں نہ غلو رکھتے ہیں نہ انکار۔ بلکہ ان دونوں نظریات میں تطبیق اور دونوں بزرگوں کی عقیدت و احترام کے جذبات سے سرشار ہیں۔

الٰہیات کے موضوع میں ایک نزاکت خاص طور پر پائی جاتی ہے جیسا کہ بعد میں ذکر آئے گا لیکن اس سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ شیخ اکبر ؒ اور حضرت امام ربانی ؒ کا زمانہ مختلف ہونے کی وجہ سے دونوں اکابر کے افکار میں کئی وجوہات سے فرق پایا جاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر دور میں فتنوں کا رُخ مختلف ہوتا ہے تو اس دور کے اکابر ان فتنوں کے رد میں اُس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے اور جس کی ضرورت نہیں ہوتی اس سے قدرے بے فکر ہوتے ہیں، تو یہی بات اس سلسلے میں بھی ہوئی کہ شیخ اکبر ؒ نے خالق اور مخلوق کے درمیان اتحاد پر زیادہ زور دیا لیکن جائز حد تک کیونکہ مخلوق کی ہر چیز خالق کے ارادے سے ہے اور خالق تمام مخلوقات کا "قیوم" یعنی ان کو تھامے ہوئے ہے اور حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے خالق اور مخلوق میں مغائرت یعنی ان میں لا محدود فرق پر زیادہ زور دیا کیونکہ مخلوق کی کسی چیز کا بھی خالق پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ان سب موجودات سے جو کہ اس کی مخلوق ہے مستغنی اور پاک ہے "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" اس کی طرح کوئی نہیں اور یہاں تک فرمایا کہ خدا موجود ہے لیکن بغیر کسی وجود کے موجود ہے کیونکہ

مخلوق صرف اُس وجود کو جانتی ہے جس میں مخلوق موجود ہے اور واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ کا وجود جو اصل وجود ہے اُس کی مخلوق کو سمجھ ہی نہیں، کیونکہ دونوں کا مؤطن (domain) مختلف ہے۔ شیخ اکبر ؒ کے بعض غالی معتقدین نے اس میدان میں وہ طوفانِ بد تمیزی برپا کیا کہ بجائے کثرت سے وحدت کے ظہور کے، کثرت کو وحدت سمجھنے لگے جس سے شرعی تعریفات ساری مبہم ہو گئیں اور زندیقی وجود میں آئی۔ ان معتقدین کی اس نارسائی کا انجام یہ ہوا کہ علامہ اقبال جیسا علامہ بھی ان غلط افکار کو شیخ اکبر ؒ کے کھاتے میں ڈالنے لگے اور ایک موقع پر کہا کہ "جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص الحکم (جو حضرت شیخ اکبر ؒ کی تصنیف ہے) میں سوائے الحاد وزندقہ کے اور کچھ نہیں ہے"۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اپنے آپ کو حضرت مولانا روم ؒ کا مرید ہندی سمجھنے کی برکت سے شیخ اکبر ؒ سے زیادہ استفادہ کیا لیکن قربان جائیں حضرت امام ربانی ؒ کے کہ ان زندیقیوں کا ایک جامع رد کرنے کے باوجود فرماتے ہیں کہ میں نظر کشف میں شیخ اکبر ؒ کو اعلیٰ درجے کی جنتوں میں پاتا ہوں۔

عبقات میں جو مثالیں دی گئی ہیں وہ چونکہ پرانی ہو چکی ہیں اور آج کل کے لوگوں کے لئے زیادہ کارآمد نہیں کیونکہ اُن سے بہتر مثالیں وجود میں آئی ہیں۔ اس وجہ سے اگر موجودہ دور کی مثالوں کی بنیاد پر بات کی جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ دوسری طرف اس وقت فلسفہ کو لوگ زیادہ نہیں جانتے سائنس کو زیادہ جانتے ہیں اس لئے اگر فلسفہ کی بجائے جہاں سائنس استعمال ہو سکتی ہو وہاں سائنس سے فائدہ لیا جائے تو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ البتہ اس میں سائنس سے مرعوبیت والی بات نہ ہو بلکہ سائنس کو استعمال کیا جائے اور جہاں سائنس کی دال نہیں گلتی وہاں اس کو نظر انداز کیا جائے۔

ہماری کوشش ہے کہ ہماری کتاب " معرفت الٰہی کا حصول" میں یہی طریقہ اپنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس میں حسنِ نیت کی توفیق عطا فرما کر اس کام کو خلوص کے ساتھ کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور اس کو امت کے لئے مفید بنا کر ہمارے لئے صدقہ جاریہ کے طور پر قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین

سید شبیر احمد کاکا خیل
حال خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ راولپنڈی

علم اور اس کے ذرائع

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا تعلق علم کے ساتھ ہے اور علم حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں اُن کی معرفت یعنی اُن کا جاننا اس مقصد کے حصول میں ان شاء اللہ مدد گار ہو گا۔ ان سے متعلق چند وضاحتیں اور کچھ متعلقہ اصطلاحات(terminologies) کو سمجھنا مفید ہو گا۔

علم کے مختلف ذرائع(means)اور معلومات(information)حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں؛

1۔ محسوسات سے حاصل کرنا

Acquisition through the perceptible objects.

2۔معلوم سے غیر معلوم کی طرف انتقال کرنا۔

Shifting from the knowns to unknowns.

3۔غیب سے حاصل کرنا .Receiving from the unseen

اس پر مزید بات کرنے سے پہلے چند اصطلاحات کی تشریح مناسب رہے گی۔

احساس اور تخیل

انسان کی یہ دونوں ذہنی صلاحیتیں (mental capabilities) مادی صفات(materialistic characteristics) والی چیزوں کی معلومات (information) سے متعلق ہیں۔

احساس میں کسی جُزوی چیز (particular) کے مادے(matter) کا انسان کے حواس خمسہ (five senses) میں سے کسیsense کے سامنے رہنا ضروری ہوتا ہے۔

جبکہ تخیل میں انسان کے senses کے سامنے اس چیز کی موجودگی ضروری نہیں۔اسی لیے اس سے حاصل کردہ معلومات (information) کبھی خلافِ واقعہ (against the reality) بھی ہو سکتی ہیں۔ تحلیلِ نفسی(psychoanalysis)

میں نفسیاتی مریضوں کے تخیل اور حقیقت میں incompatibility کو دور کیا جاتا ہے-

توہم اور تعقل

یہ دونوں انسانی ذہنی شعبے (mentalfaculties) غیر مادی چیزوں کی معلومات (Information) سے متعلق ہیں۔ توہم میں وہ غیر مادی چیز کلی (generalized) نہیں ہوتی۔ جیسے شیخ کی صحبت میں حاصل ہونے والا سکینہ، طمانیت اور غیب کی طرف توجہ۔ تصوف میں اس شعبے (faculty) کی تہذیب ذکر اذکار سے ہوتی ہے-

جبکہ تعقل میں غیر مادی اشیاء کا کلی (generalized) علم حاصل ہوتا ہے۔ مذہب میں عقائد کا تعلق اسی علم کی اصلاح سے ہے۔ جبکہ سائنس میں بدیہات (self-evident facts) کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ اس کا تعلق علم کے پہلے ذریعے یعنی محسوسات سے ہے۔ جیسے آگ گرم ہے۔ وغیرہ

نظر اور حدس

ان کا تعلق علم کے دوسرے ذریعے یعنی معلوم سے غیر معلوم کی طرف انتقال کرنے (shifting from the knowns to unknowns) سے ہے- نظر میں ذہن معلوم (known) سے نامعلوم (unknown facts) کی طرف تدریجًا (gradually) منتقل (shift) ہوتا ہے۔ سائنس کا علم اسی قسم سے ہے۔ اس علم میں بتدریج اضافہ (gradually evolve) ہوتا ہے-

جبکہ حدس میں معلوم سے نامعلوم کی طرف ذہن کا انتقال تدریجاً نہیں بلکہ دفعتاً ہوتا ہے۔ صوفیاء کا علمِ اعتبار اسی قسم سے ہے۔

معرفت اور ذوق

ان کا تعلق علم کے تیسرے ذریعے تلقی بالغیب (receiving from the unseen) سے ہے۔ یہ عقل کی range (رینج) سے بلند ہیں۔ ذوق میں غیب کی معلومات (information) کا ادراک، احساس کی نوعیت سے ہوتا ہے اور یہ اجمالی ہوتا ہے۔ اس سے حاصل شدہ علم، علمِ حقائق کہلاتا ہے۔ جبکہ معرفت میں غیب کی

چیزوں کا ادراک تفصیلی ہوتا ہے۔ اس سے حاصل شدہ علم حکمت کہلاتا ہے۔ان کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

نقل

جو معلومات معصوم (پیغمبر) کی خبر سے حاصل ہوتی ہیں، اُن کو نقل کہتے ہیں۔یہ بھی علم کے دوسرے ذریعے معلوم کے ذریعے نامعلوم کے جاننے (knowing unknown from the known) سے تعلق رکھتا ہے- لیکن اپنی افادیت اور پھیلاؤ کی وجہ سے یہ معلومات (information) کا ایک مستقل ذریعہ بن گیا ہے-

کچھ اہم باتیں

ختم نبوت یعنی وحی کے منقطع ہونے کے بعد غیب سے معلومات (information) حاصل کرنے کے لئے تمام مختلف طریقوں الہام، سچے خواب اور کشف کے لئے ایک ہی نام (generalized term) کشف عام طور پر استعمال ہوتا ہے-

علم کے جو مختلف ذرائع بیان ہوئے، ان میں سے بدیہات اور حواس سے متعلقہ علوم (immediate perceptions) کی انسانی کمال کے لحاظ سے اہمیت نہیں ہے۔ اس لئے اس کتاب کے دائرہ سے خارج ہیں۔

ایک اہم نتیجہ

مندرجہ بالا تشریحات سے جب ہم اپنی ضرورت پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے لئے عموماً کشف ، نقل اور عقل معلومات (information) حاصل کرنے کے سب سے اہم ذریعے ہیں- اگر ان ذرائع کے استعمال میں کوئی نقص (flaw) نہ ہو، تو تینوں کے نتائج میں کوئی اختلاف (contradiction) نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سارے علوم کا منبع ایک ہی ہے- البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ذریعے سے حاصل کردہ معلومات (information) کے متعلق دوسرا ذریعہ خاموش ہو لیکن اس کو تضاد (contradiction) نہیں کہا جاسکتا۔

ان ذرائع کے باہمی تقابل (comparison) سے معلوم ہوتا ہے کہ نقل کی غلطی کی اصلاح سب سے آسان ہے۔یہ سب سے محفوظ ہے۔ عقل کا استعمال سب

سے زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ کشف کا احاطہ (span) سب سے زیادہ وسیع ہے۔

ان تینوں ذرائع یعنی نقل، عقل اور کشف میں خلل اور غلطی کی گنجائش بھی ہوسکتی ہے اور ان غلطیوں کی اصلاح کا طریقہ بھی ان تینوں کے لئے موجود ہے۔ مثلاً نقل میں غلطی یہ ہوسکتی ہے کہ معصوم (پیغمبر) تک سند کو پہنچانے میں کمزوری پائی جائے، راوی کے حافظہ میں بھی نقص ہوسکتا ہے یا وہ کسی وجہ سے سمجھ میں غلطی کررہا ہو یا قصداً جھوٹ بول رہا ہو یا بغیر کسی معقول وجہ کے کوئی اس سے اصل مطلب لینے کی بجائے کوئی دوسرا مطلب لے رہا ہو۔ ان تمام ممکنات کی وجہ سے روایت کے محققین نے ان تمام نقصانات سے بچنے کا بطریق احسن انتظام کیا ہے جیسے محدثین میں اصحاب الرجال نے یہ ذمہ داری اٹھائی کہ وہ راویوں کے تزکیہ میں بڑے تشدد سے کام لیتے تھے۔ اس کے لئے احادیث شریفہ کے جمع کرنے کے اصول وضع ہوئے جس میں اصولی بنیادوں پر احادیث شریفہ کا چناؤ کیا گیا۔ اس میں بعض حضرات نے صحت پر زور دیا اس لئے روایتوں کو پرکھنے میں تشدد سے کام لیا اور بعض نے ممکنہ تشدد کی وجہ سے کسی روایت کے ضائع ہونے سے بچنے کے لئے وسعت سے کام لیا۔ البتہ فقہاء نے ان ہی بنیادوں پر صحیح روایات کو مسائل میں استعمال کیا اور جن میں وسعت روا رکھی گئی اور اس لئے ضعیف کہلائیں ان کو فضائل میں استعمال کیا۔ جو نقل میں غلطی کے امکان کی وجہ سے تمام منقولہ احکامات کو مشکوک بنانا چاہتے ہیں اُن کے شر سے بچنے کے لئے اتنی بات کافی ہے۔

اس طرح کشف کی راہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں یہ ممکن ہے کہ کسی شیطان نے غلط بات مکشوف کروائی ہو یا پھر طبیعت میں کسی خرابی کی وجہ سے اِدھر اُدھر کے خیالات مکشوف ہوئے ہوں۔ جیسے بعض بیماریوں میں ایسا ہوتا ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کشف کی کڑیوں کو ملانے میں غلطی ہوجاتی ہے تو نتیجہ غلط ہوجاتا ہے۔ یہی حال خواب کا بھی ہے۔ ان دونوں کے اس قسم کے نقصانات سے بچنے کے لئے اگر کچھ اصول وضوابط پر عمل کیا جائے تو نقصانات سے بچا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ شریعت میں کشف یا خواب کو ظنی قرار دیا ہے اس لئے قطعی خبر کے مقابلے میں اس کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ چاہے وہ بات نقل کی ہو یا عقل کی۔ البتہ اس کے علاوہ کسی بھی جگہ اگر اس کا استعمال مفید ہو تو اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکے گا۔ ان دونوں کی تشریح ہر دو قطعیات کی روشنی میں کی جائے گی۔ اگر کشف عقل سے ٹکراتا ہو تو اُس

کو بھی نہیں مانا جائے گا اور اگر شریعت سے ٹکراتا ہو تو بھی اُس کو نہیں مانا جائے گا۔

بعض اوقات ان تینوں ذرائع میں کسی ایک سے جو معلومات حاصل ہوتے ہوں اور دوسرے ذریعے نے اگر اس سے خاموشی اختیار کی ہو تو ایسی صورت میں متعارض ہونے یعنی ایک دوسرے کے خلاف ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مثلاً عقل کی بہت ساری باتوں میں نقل فریق ہی نہیں اور وہ اس نے اس پر چھوڑے ہوئے ہیں۔ "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ" میں اسی کا اظہار ہے۔ تاہم جس بات میں نقل کا قطعی بیان موجود ہو تو عقل کی گفتگو کا اس بارے میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھا فیصلہ اس میں کیا ہے کہ نقلی دلیل اور عقلی دلیل کے قطعی اور ظنی ہونے کی چار صورتیں ممکن ہیں۔

ا۔ نقلی دلیل قطعی ہو اور عقلی دلیل بھی قطعی ہو۔ ان میں تعارض قیامت تک ممکن نہیں۔

ب۔ نقلی دلیل ظنی ہو اور عقلی دلیل بھی ظنی۔ اس صورت میں نقلی دلیل کو ترجیح دی جائے گی۔

ج۔ نقلی دلیل قطعی ہو اور عقلی دلیل ظنی ہو۔ اس صورت میں بدرجہ اولیٰ نقلی دلیل کو ترجیح حاصل ہوگی۔

د۔ نقلی دلیل ظنی ہو اور عقلی دلیل قطعی ہو۔ اس صورت میں عقلی دلیل کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اسی کو درایت کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ علم کا زیادہ محفوظ طریقہ نقل ہے۔ اس میں ممکن نقصانات کا ازالہ بہت آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ عقل کے ساتھ ہماری دنیا کے بے انتہاء امور وابستہ ہیں۔ نقل کو پرکھنے کے لئے جو طریقے وضع کئے گئے ہیں اس میں بھی عقل کو استعمال کیا گیا ہے۔ فقاہت کا تعلق بھی عقل اور تقویٰ کے ساتھ ہے۔ اس لئے عقل اگر اپنی حدود میں رہے تو اس کا استعمال عین مطلوب ہے لیکن جس امر کا تعلق غیب کے ساتھ ہے یا معصوم کے امر کے ساتھ ہے اس میں عقل کا اختلاف بے محل ہے اس لئے اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

کشف سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ معرفت کے

لئے جو اشارے نصوص میں موجود ہیں ان میں جو خلائیں ہیں ان کو کشف اور عقل دونوں کے ملاپ کے ذریعے پُر کیا جاسکتا ہے۔یہ چونکہ ہر شخص کی اپنی اپنی استعداد کے موافق ہوتی ہے اس لئے ہر ایک کی معرفت جُدا ہوتی ہے۔اس کے علاوہ علم لدنی کا بہت بڑا ذخیرہ کشف اور الہام کے ساتھ وابستہ ہے جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔اس کی مثال "آفتاب دلیل آفتاب است" کی مانند ہوتی ہے۔ کہ جس کو حاصل ہوتا ہے دوسروں کو پتا چلتا ہے کہ یہاں صرف منقول نہیں کچھ اور بھی ہے۔ لیکن کہاں سے ہے؟ اس کا سِرا کسی کو نہیں ملتا تو لامحالہ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں سے ہے جہاں سے سارے علوم کا منبع پھوٹتا ہے۔

ان سب کے ہوتے ہوئے اب اگر ان میں سے کسی ایک ذریعے پر کوئی کسی طرح مطمئن ہو اور دوسرے میں جو خلل کا قدرتی امکان ہے اس کو وہ بڑھا چڑھا کر پیش کرے اور اس کی اصلاح کے ممکنہ طریقوں سے صرفِ نظر کرے تو اس کو بے انصافی کہا جائے گا۔ اگر کوئی اس پر بضد ہو تو اس کو روکا تو نہیں جا سکے گا لیکن اُس کو محقق بھی نہیں کہا جاسکے گا اور اس کی باتوں کو تعصب پر مبنی سمجھا جائے گا۔

اس قسم کا تعصب آج کل کے کچھ گمراہ مفکرین (intellectuals) کے ہاں نظر آتا ہے کہ وہ کسی مسلّمہ دینی بات میں شُبہ(doubt)پیدا کر دیتے ہیں اور یہ شبہ کسی ایسی دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے جس کو عوام الناس پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔پھر اس شبہے کو علمی سنجیدگی سے حل کرنے کی بجائے جدید ذرائع ابلاغ (ٹی وی، سوشل میڈیا) کے ذریعے فوراًپھیلا دیا جاتا ہے۔بہت سارے لوگ دلیل کے محض ظاہر سے متاثر ہو کر شکوک و شبہات اور (confusion) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علم کے دو بڑے اہم ذریعوں نقل اور کشف کے بارے میں بھی اسی قسم کے شکوک اور وساوس پیدا کئے گئے ہیں۔ایسے لوگ عموماً اس سلسلے میں فلسفہ اور سائنس کے ناموں کو استعمال کرتے ہیں۔

سائنس کی حقیقت

سائنس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا تعلق معلوم کی بنیاد پر نامعلوم کو جاننے سے ہے۔ مثلاً گرم پانی اور ٹھنڈا پانی جب آپس میں ملتا ہے تو ایسا پانی وجود میں آتا ہے جو گرم سے کم گرم اور ٹھنڈے سے گرم ہوتا

ہے اور ہم وضو کے لئے اپنے مطلوبہ درجہ حرارت کا پانی استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ ایک معلوم چیز ہے۔اب اگر میں پوری مسجد کے لئے اس قسم کا خود کار نظام بنانا چاہوں کہ سب کو ایک مناسب درجہ حرارت پر وضو کا پانی ملے تو اس نظام کے حساب کتاب کو جاننے کی کوشش کروں گا کہ پانی گیزر میں جس درجہ حرارت تک گرم ہو وہ معلوم ہو اور جتنا پانی اس وقت کنویں یا نل سے ٹھنڈا آرہا ہے اس کا درجہ حرارت بھی معلوم ہو تو دونوں کے valves کتنے کتنے کھولے جائیں جس سے مطلوبہ درجہ حرارت حاصل ہو۔ اس سے پتا چلا کہ کچھ معلومات تھیں ان کی بنیاد پر ہم نامعلوم حقائق تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ سائنس ہے جس کا مذہب نے کبھی انکار نہیں کیا اور "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ" کے قول سے یہ سب کچھ جائز ہوگیا۔اس طرح جو بھی سائنسی طریقے ایجاد ہوئے تو ان کے جائز استعمال پر مذہب کوئی پابندی نہیں لگاتا۔

دوسری طرف سائنس کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ترقی پذیر رہتی ہے۔ اس کی کسی حالت کو کبھی بھی ہم حتمی نہیں کہہ سکتے۔ عین ممکن ہے کہ آج جو سائنسدان کسی چیز کے صحیح ہونے کے پُرزور دلائل دے رہا ہے کل وہی سائنسدان یا اس کا کوئی دوسرا بھائی اس کا پُرزور رد کررہا ہو۔زمین کے گرد سورج چکر لگاتا ہے یہ کہنے والے بھی سائنسدان تھے اور سورج کے گرد زمین چکر لگاتی ہے یہ کہنے والے بھی سائنسدان ہیں۔ اُس وقت کے سائنسدان اُس کے حق میں دلائل دے رہا تھا۔ اِس وقت کا سائنسدان اِس کے حق میں دلائل دے رہا ہے۔وقت وقت کی بات ہے۔نہ تو پہلی بات کو سائنس سے نکالا جاسکتا ہے اور نہ اِس وقت کی بات کو حتمی کہا جا سکتا ہے۔اس لئے کہ سائنس متغیر ہے کیونکہ اس کی بنیاد تجربات اور مشاہدات پر ہے جن میں تبدیلی کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ اس لئے یہ ہمیشہ متغیر رہے گی۔ اس کی اس حقیقت کے پیش نظر اس کا مفید کاموں میں استعمال ہمیشہ سراہا گیا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر مثال میں بتایا گیا کہ اس کے ذریعے ہمارے روزمرہ کام ہوتے ہیں لیکن وہ علوم جو غیب سے حاصل ہوتے ہیں ان پر سائنس کی بنیاد پر تنقید نہیں ہوسکتی کیونکہ مذہب کا دعویٰ کبھی بھی مشاہدات اور تجربات پر مبنی نتائج پر نہیں بلکہ اس کا پہلا مطالبہ ہی غیب پر ایمان ہے۔ اس لئے سائنسی چیزوں کو ہم مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر رد کرسکتے ہیں کیونکہ یہی اس کی بنیاد ہے لیکن مذہبی باتوں کی پرکھ اس پر ہے ہی نہیں۔اس لئے مشاہدات اور تجربات کو بالفاظ دیگر اس کے لئے معیار نہیں بنایا جاسکتا۔

یہ الگ بات ہے کہ چونکہ حقانی مذہب اور سائنس دونوں کا منبع ایک ہے۔ اس لئے سائنس میں جوں جوں ترقی ہو رہی ہے وہ اسلام کے ان اصولوں کی تصدیق کرتی رہی ہے۔ جن کا تعلق اس دنیا کے ساتھ ہے۔ البتہ جن کی تصدیق ابھی تک نہیں کر سکی تو انتظار کرنا پڑے گا کہ سائنس اس مقام پر پہنچ جائے جس سے وہ ان کی تصدیق کر سکے ۔ البتہ جن باتوں کا تعلق عالم آخرت کے ساتھ ہے۔ اس کی تصدیق سائنس کے بس میں ہی نہیں کیونکہ ان کا زمان و مکان ہی مختلف ہے۔

نقل کے قابل بھروسہ ہونے (reliability) پر شبہات اور اس کا جواب

ان مفکرین کے نزدیک نقل میں الفاظ کے ذریعے جو علم پہنچتا ہے، وہ کبھی بھی قطعی اور یقینی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ:

ا۔ معصوم کی خبر ہم تک ہمارے جیسے انسانوں کے ذریعے ہی پہنچی ہے۔ اور ظاہر ہے، انسان بھول چوک اور غلطی سے پاک نہیں ہوتا۔

ب۔ جس طرح عام بول چال میں اکثر بات کرنے والا جو لفظ استعمال کرتا ہے اس سے اس کی مراد وہ معنیٰ نہیں ہوتے جو عام طور پر لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح معصوم کے الفاظ سے ان کا اصل مقصد کیا تھا؟ اس کا قطعی تعین ہم کیسے کر سکتے ہیں کہ اس سے وہی مراد ہے جو ہم سمجھ رہے ہیں؟

ان شبہات کا حل

ا۔ معصوم کی خبر ہم تک انسانوں کی ایک بڑی جماعت کے ذریعے مسلسل نسل در نسل منتقل ہو کر پہنچی ہے۔ ایسی صورت میں اس خبر پر ایک فردِ انسانی کی بھول چوک اور غلطی کے اثر کا خطرہ زائل ہو جاتا ہے۔

ب۔ قرآن اور حدیث کے بعض الفاظ کے مفاہیم کو محفوظ کرنے کے لئے جاہلی شاعری تک کو محفوظ کیا گیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اِس لفظ سے کیا مراد لیا جاتا تھا کیونکہ وقت کے ساتھ زبان تبدیل ہوتی ہے۔ تو اس وقت کی شاعری میں جو قرآن و حدیث کے الفاظ آگئے ہوں تو اس سے جو معنیٰ مراد لیا گیا

وہی اس وقت مستعمل تھا تو اُن کو اُسی معنٰی میں قرآن و حدیث میں بھی استعمال کیا جاسکے گا۔ ویسے بھی کسی شخص کے الفاظ کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اس کا اندازہ لگانا اتنی پیچیدہ اور مشکل بات بھی نہیں۔ بلکہ سیاق و سباق (background) اور context بھی جب ان الفاظ کے ساتھ ہی منتقل ہوا ہو تو بآسانی معنٰی کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً آپ کسی کو مار کھاتے دیکھتے ہیں تو اس کے نتیجے میں اُس کے منہ سے مارنے والے کے لئے نکلنے والے الفاظ کے معنٰی باآسانی متعین کیے جاسکتے ہیں۔

عام گفتگو میں بھی ہم الفاظ سے وہی مطلب لیتے ہیں جو الفاظ کا عام مشہور مطلب ہو یا پھر جو سیاق و سباق، context اور situation کے مطابق ہو۔ اگر اس گفتگو میں مجازی معنٰی لینے کا قرینہ (likelihood) نہ ہو تو پھر مجازی (virtual) معنٰی لینے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ باقی جس کو شک کی بیماری ہو اس کو تو کوئی مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز میں احتمالات نکال سکتا ہے۔

معصوم یعنی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی کے متعلقہ (related) واقعات کے ذریعے، آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے الفاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

کشف کے بارے میں ایک عجیب اشکال

کشف اور الہام کے بارے میں ایک عجیب اشکال ایک صاحب نے کیا ہے کہ الہام اور کشف کے بارے میں جتنی باتیں قرآن میں ہیں وہ گزشتہ امتوں کی باتیں ہیں۔ اس امت میں تو صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی ہوسکتے ہیں جن کو الہام ہوتا تھا باقیوں کے بارے میں نہیں۔

جواب۔ عجیب بات ہے قرآن میں تو گزشتہ اُمتوں ہی کا ذکر زیادہ آسکتا تھا لیکن یہ امت تو گزشتہ امتوں سے زیادہ مقرب ہے تو گزشتہ امتوں کو جو چیز حاصل تھی وہ اس امت کو حاصل نہیں تھی۔ یہ کیسی بات ہے؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا وافر حصہ ملا تھا لیکن باقیوں سے انکار نہیں ہے کیونکہ مبشرات کو تو نبوت کا "مابقی" فرمایا گیا ہے کہ مبشرات ہوں گے۔ امت میں بڑے بڑے معبرین جیسے ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باقاعدہ خوابوں

کے بارے میں پوچھتے تھے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ خوابوں، کشفوں اور الہام سے آپ ﷺ کی دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد کوئی شرعی بات ثابت نہیں کی جاسکتی۔ البتہ جن باتوں کا تعلیم و تربیت اور معرفت کے ساتھ تعلق ہے ان میں یہ استعمال ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ یہ شریعت پر چلنے اور یقین محکم کرنے کے ذرائع ہیں۔ ذرائع میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور یہ ہر ایک کے لئے مختلف ہوتے ہیں۔ تو ان چیزوں میں ان علوم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کسی شرعی حکم کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ شرعی حکم قرآن و سنت، اجماع اور قیاسِ مجتہد سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کو ظنی سمجھنے سے اس خدشے کی بیخ کنی ہوگئی کہ غلام احمد قادیانی نے الہامات کے ذریعے جو دینی اصولوں کی مخالفت کی ہے الہامات اور کشفوں کی بات ماننے سے اُس کے بات کی تائید ہوجائے گی۔ وہ چونکہ شریعت میں تبدیلی کے اور اپنے لئے نبوت کو ثابت کرنے کے درپے ہے جس کے لئے الہامات، کشفوں اور خوابوں سے ثبوت کے لئے کوئی راہ نہیں تو وہ کیسے اس تحقیق سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ باتیں کرنے والے ایک طرف تو ایسی باتیں کرنے والے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے بڑے کہتے ہیں دوسری طرف وہ جب کشفوں اور الہامات کی باتیں کرتے ہیں تو ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

علم کے تین ذرائع کے استعمال کے بارے میں چند یاد رکھنے کی قابل باتیں

لب لباب کے طور پر ان تینوں مذکورہ ذرائع کے بارے میں چند باتیں پیش نظر رہنی چاہیے تاکہ افراط تفریط سے بچا جاسکے۔

1۔ کسی چیز کی دلیل کا نہ ہونا، یا کسی مخصوص شخص یا گروپ کا اسے نہ پانا، اس چیز کے نہ ہونے کو ثابت (prove) نہیں کرتا۔ سائنس سے تعلق رکھنے والا، غیب (کشف) سے علم پانے والوں کی خبر اس بنیاد پر رد نہیں کرسکتا کہ اُسے اس بات کی کوئی سائنسی دلیل نہیں ملی۔ کیونکہ غیب سے علم پانے والے کی دلیل کو سمجھنے کے لئے بھی کچھ متعلقہ background اور prerequisites کی ضرورت ہوتی ہے۔

2۔ کسی بات کے بارے میں خاموشی، اور اس کا انکار، یہ دو الگ چیزیں ہیں۔ ان

دونوں باتوں کو خلط ملط (mixedup) نہیں کرنا چاہیے۔ سائنس کی بہت ساری دریافتوں کے بارے میں مذہب خاموش ہے۔ یہ ان باتوں کا انکار نہیں۔ اس طرح مذہب کی کچھ خبروں (غیب سے متعلق عقائد) کے متعلق سائنس خاموش ہے۔ یہی معاملہ نقل اور کشف کا آپس میں بھی ہے۔

3۔ ہر چیز کا واقعی حال عقل سے معلوم ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً روح کا حال عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا۔

4۔ اسی طرح مذہب نے ہر واقعی چیز کے بیان کی ذمہ داری نہیں لی۔ مذہبی لوگوں سے اس معاملے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنے دنیاوی معاملات بہتر جانتے ہو۔ مذہب کو غیر مذہبی معاملات میں استعمال کرنے کی اکثر وجہ اپنی مخفی دنیاوی خواہش کو تقدس کا رنگ دے کر پورا کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے شیخ اور مربی سے اصلاح نفس کے بجائے دنیاوی معاملات میں مشورہ دینے پر اصرار کرنا، جس کا بعض اوقات شیخ کو تجربہ نہیں ہوتا۔

5۔ البتہ مذہب نے جس چیز کا انکار کیا ہے، تو وہ واقع میں موجود نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کی بنیاد وحی پر ہے، جو اٹل ہے۔ اس میں سائنس کی findings کو نہیں دیکھا جائے گا، جو متغیر ہے۔